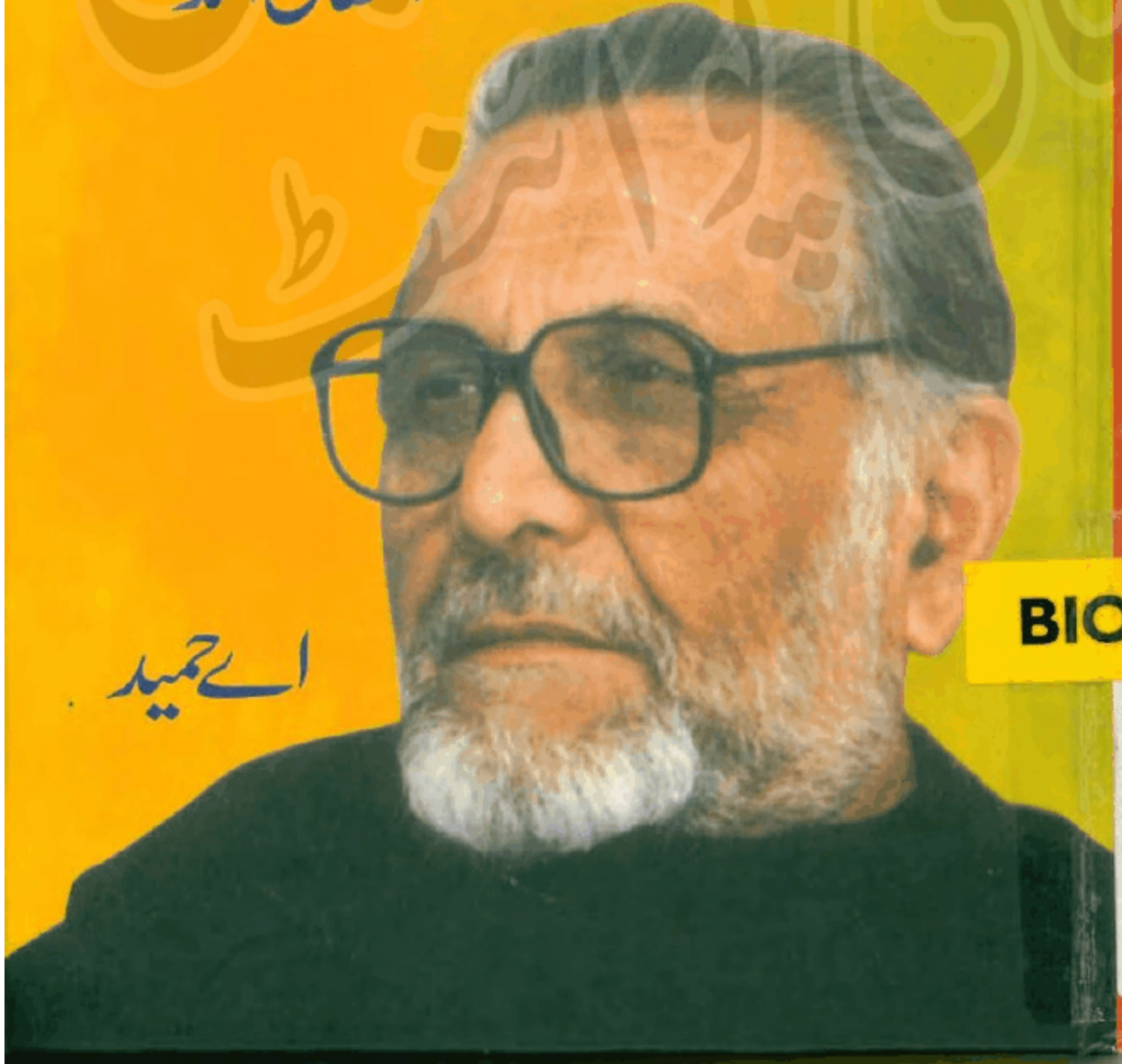


داستان گو

اشفاق احمد

ای حمید

BIO



داستان گو

اشفاق احمد

اے حمید

سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور

اشفاق احمد نے ماڈل ٹاؤن میں اپنا جو گھر بنایا ہے اس کا نام ”داستان سرائے“ رکھا ہے۔ میں ”داستان سرائے“ کے باغیچے میں بانس کے ایک چھوٹے سے درخت کے سامنے کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ بانس کی پوریاں ابھی پتلی تھیں اور ان کا رنگ زرد تھا۔ بانس کی یہ قسم ہمارے ہاں بہت کم ہوتی ہے۔ میں نے زرد بانس کے درخت برا، تھائی لینڈ کے باؤر کے جنگلوں میں دیکھے ہیں۔ پیچھے سے اشفاق احمد نے مجھے آواز دی۔

”کیا دیکھ رہے ہو؟“

میں نے کہا۔ ”یہ بانس کا پودا تم نے کہاں سے لیا تھا؟“

وہ ہنس پڑا۔

”یہ زرد بانس بہت نام کے جنگلوں میں آتا ہے۔ ایک نرسری سے مل گیا تھا باہر سردی ہے اندر آ جاؤ۔ چائے آرہی ہے“

اشفاق احمد نے اپنے مکان کا دیوان خانہ کافی کھلا کھلا بنایا ہے۔ باغیچے کی طرف پیشے کی لمبی دیوار ہے جو سفید جالی دار پردوں سے ڈھکی رہتی ہے۔ وہاں بیٹھے ہوئے میرا کئی بار دل چاہتا ہے کہ اٹھ کر پردہ ہٹاؤں اور باغیچے کو دیکھوں۔ ہم دونوں دیوان خانے میں آکر بیٹھ گئے اور باتیں کرنے لگے۔ اتنے میں چائے آگئی۔ نوکر چائے بنانے لگا تو میں نے اسے روک دیا۔ میں نے خود چائے بنائی۔ چائے کا رنگ بنا رہا تھا کہ میں بہت اچھی ہوں۔ چائے واقعی اچھی تھی۔ میں نے اس کی تعریف کی تو اشفاق نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”میرا خیال ہے آج قدسیہ نے چائے دم کی ہے“

میں نے کہا۔

"ایسی جائے کوئی بلذوق خاتون ہی دم کر سکتی ہے۔ تم اور تمہارا نوکر یہ جائے تیار نہیں کر سکتا"

میں نے کاپی اور ہال پوائنٹ سامنے رکھ لیا۔ سگریٹ سلگایا اور اشتقاق سے کہا۔

"اب تم ان گلی کوچوں کا ذکر کرو جہاں کھیل کود کرتے اپنے بچپن گزارا۔ تمہارا قصبہ شہر سے کتنی دور تھا۔ کیا وہاں کوئی دریا بھی بہتا تھا؟ مجھے اپنے قصبے کے کھیتوں، امود کے باغوں، بھلی کے درختوں اور تالابوں کے پاس لے چلو تاکہ میں تمہیں وہاں دوڑتے بھاگتے دیکھوں۔ تم بولتے جاؤ، مجھے جو بات نوٹ کرنی ہوگی کرنا جاؤں گا۔"

اشفاق احمد نے بتایا کہ جس قصبے میں وہ پیدا ہوا اس کا نام کتسر تھا۔ کتسر فیروز پور شہر سے پچاس میل دور تھا۔

"یہ سکھوں کا حبرک مقام بھی ہے۔ 92 فی صد آبادی سکھوں کی تھی۔ ایک بہت بڑا گرووارہ بھی تھا۔ کتسر سے دریائے ستلج 33 میل دور تھا۔ یہ مالوے کا علاقہ تھا اور یہاں کے سکھ ڈاکو بڑے مشہور تھے۔ یہ کدو قسم کے لوگ موسیقی والے سکھ تھے۔ یہ سارا خشک قسم کا علاقہ تھا۔ بارانی فصلیں ہوتی تھیں۔ نہ جانے کیسے آبلہ ہو گیا۔ آبادی والی کوئی بات نہیں تھی۔ جھنڈ، کریر، پھلاہی کے درخت عام تھے۔ کہیں کہیں ٹاہلیاں بھی تھیں۔ اس کتسر کے قصبے میں اجڑا واری پتی محلہ تھا۔ اس محلے میں ہمارا ایک حویلی تھا مکان تھا۔ ایک منزلہ گھر کے پھانک کے سامنے گلی کراس کریں تو ایک واڑہ تھا جس میں گھوڑے بھینسیں وغیرہ بندھی ہوتی تھیں۔

میرے میزک کرنے کے بعد ہمارے قصبے میں بجلی آئی تھی۔ یعنی قیام

پاکستان سے چار سال پہلے — بجلی گھر کے گرد بارخ بنا ہوا تھا۔ یہاں ایک ٹینس کورٹ بھی تھا۔ تحصیل دار اور تھانیدار وغیرہ یہاں ٹینس کھیلتے کرتے تھے۔ کبھی کبھی انگریز ضلع افسر بھی آ جاتا تھا۔ ہم لڑکے اوھر جاتے گھبراتے تھے۔ یہاں دو تالاب بھی تھے۔ بہت بڑے تالاب۔ ان کا پانی صاف کر کے بڑی بڑی ٹینکیوں میں جاتا تھا۔ تالاب کے کنارے شریمن، جامن اور ٹاہلیوں کے درخت تھے۔۔۔۔۔"

اشفاق احمد میرے سامنے بیٹھا اپنے قصبے کتسر کی گلیوں بازاروں، حویلیوں، تالابوں، ٹاہلیوں، پھلاہی کے درختوں اور گھر کے زرد پھولوں کی باتیں کر رہا تھا اور میں اس کی دی ہوئی ڈائری پر شکستہ خط میں لکھتا جا رہا تھا۔ پھر میں نے لکھنا بند کر دیا۔ اب میں اشتقاق کو دیکھ رہا تھا۔ اب اس نے ڈاڑھی رکھ لی ہے۔ میں نے اس کی ڈاڑھی میں کبھی دخل نہیں دیا۔ وہ چاہے جتنی مرضی ڈاڑھیاں رکھ لے۔ جتنی چاہے اپنے چہرے پر لکیریں ڈال لے۔ مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس کی ایک وجہ ہے۔ وجہ یہ ہے کہ میں ہمیشہ 1948ء کے اشتقاق احمد کو دیکھتا ہوں۔ مجھے اس کے بدلے ہوئے چہرے میں ہمیشہ 1948ء کے اشتقاق احمد کا سرخ و سفید شکستہ اور مروانہ وجاہت والا چہرہ نظر آتا ہے۔ میرے لئے اس کے چہرے میں ذرا سا بھی فرق نہیں پڑا۔

انتا یاد ہے کہ وہ مجھے پہلی بار 1948ء میں لاہور میں ملا تھا۔ ظاہر ہے پاک فنی ہاؤس میں یا اس کے آس پاس کہیں کافی ہاؤس کے قریب ہی ملا ہو گا۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ جب میں نے اسے پہلی بار دیکھا تھا تو مجھے مشہور امریکی ایکٹر کرک ڈگلس یاد آ گیا تھا۔ وہی چوڑا چمکا چہرہ مضبوط جڑا، فراخ ماتھا، پوڑے کدھے، سرخ و سفید رنگ۔ — اس کے چہرے پر ایک تاثر تھا۔ کچھ اس قسم کا تاثر، جیسے وہ کوئی شرارت کرنے

والا ہے یا کوئی شرارت کر کے آ رہا ہے۔ دوسری بات جو میں نے پہلی ملاقات میں نوٹ کی یہ تھی کہ وہ باتیں بہت کرتا ہے۔ دلچسپ باتیں کرتا ہے اور اس میں لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی بڑی صلاحیت ہے۔ ہم تقریباً ہم عمر تھے۔ میں بھی لوجوان تھا۔ وہ بھی لوجوان تھا۔ ہمارے ایک ایک یا دو دو افسانے ادبی رسالوں میں چھپ چکے تھے اور ہم نے ادب میں اپنا ایک مقام بنا لیا تھا۔ اپنے اس ادبی مقام کا مجھے بہت دیر بعد جا کر پتہ چلا۔ میں اپنی محبتوں کے جذب میں ڈوبا ہوا تھا اور اسی کیفیت میں افسانے پر افسانے لکھ رہا تھا۔ محبت میں جو میرے دل کی حالت ہوتی تھی میں افسانوں میں اسے بیان کر دیتا تھا۔ ان دنوں میرے پہلے افسانے ”منزل منزل“ کی ہیروئین راجدہ سے میرا بڑا دل گداز رہا۔ رومان چل رہا تھا۔ لاہور کی اس کشمیری نژاد لڑکی کا اصلی نام کچھ اور تھا۔ میں نے افسانے میں اس کا نام راجدہ لکھا تھا۔ ایک دن میں نے اشفاق احمد سے پوچھا کہ کیا وہ بھی کسی لڑکی سے محبت کرتا ہے؟ وہ کچھ شرماسا گیا تھا۔ میں نے بھی مزید کچھ نہیں پوچھا تھا۔ ایک بات میں آپ کو شروع میں ہی بتا دیتا چاہتا ہوں کہ میرے مشاہدے اور تجربے کے مطابق اشفاق بنیادی طور پر شرمیلا آدمی ہے۔ اور مجھے اس کا یہ پہلو بھی اچھا لگتا ہے۔ شاید اس لئے کہ محبت میں اس کی ضد ہوں۔

میں اشفاق احمد سے 1948ء میں اپنی پہلی ملاقات کا ذکر کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ اپنی پہلی ملاقات مجھے بالکل یاد نہیں ہے۔ ماضی کے دھند لکوں پر نظر ڈالتا ہوں تو کچھ جھلکیاں ہی ابھرتی ہیں۔ جیسے موسلا و حار بارش کے بعد بادلوں میں دور کبھی کبھی بجلی چمکتی دکھائی دیتی ہے۔ اس نے ایک بار مجھے بتایا تھا کہ جب مشرقی پنجاب سے سماجیوں کے لئے ہوئے قافلے پاکستان میں آ رہے تھے تو وہ والٹن کیپ میں رجسٹر پر سماجیوں کے نام وغیرہ درج کیا کرتا تھا۔ پھر وہ ملتان چلا گیا اور وہاں

سماجیوں کیپ میں کام کرنا رہا۔ مگر وہاں زیادہ دیر اس کا قیام نہ رہا اور وہ لاہور آ گیا۔ انہیں نمبر ایک مزنگ روڈ والا مکان الٹ ہو چکا تھا۔ اس مکان کی چھین چار منزلیں تھیں اور ایک زینہ ہر منزل سے ہوتا ہوا اوپر والی منزل تک جاتا تھا۔ اس اوپر والی منزل میں اشفاق احمد کا اپنا سٹوڈیو تھا۔ ان دنوں وہ پینٹنگ بھی کرتا تھا۔ کمرے میں کتابیں، تصویروں کے فریم، رسالے ہر قسم کی چیزیں بھری ہوئی تھیں۔ ایک اینڈل تھا جس پر ایک کیبوس رکھا ہوا تھا۔ اس کیبوس پر ایک آکل پینٹنگ بنی ہوئی تھی۔ یہ تجریدی آرٹ تھا جو مجھے اچھا نہیں لگا تھا۔ بعد میں یہی تصویر ممتاز مفتی کی کتاب ”سارا ایں“ کے ٹائٹل پر نظر آئی۔ یعنی ”سارا ایں“ کتاب کا سرورق اشفاق احمد نے بنایا تھا۔ جب اشفاق مجھے اپنی بھائی ہوئی پینٹنگ دکھا رہا تھا تو مجھے یاد ہے کمرے میں بڑا صوف اور گرمی تھی۔ مجھے یہ گرمی اور جس آج تک یاد ہے۔ ماضی کے دھند لکوں میں ایک روشنی سی چمکتی ہے اور میں اور اشفاق چہرہ مفتی باقر کے ایک تنگ بازار میں جا رہے ہیں۔ اشفاق چہرے پر لگانے والی کریم کی خالی شیشیاں خریدنے میں آ رہا ہے۔ میں اس کے ساتھ ہوں۔ ہم دکان دکان پھر کر شیشیاں دیکھ رہے ہیں۔ اشفاق احمد اندرون لاہور کے کلچر پر تبصرہ بھی کر رہا ہے۔ یہاں سے ہم شاہ عالی کی لال مسجد کے پاس نکل آئے ہیں۔ سارا شاہ عالی ٹوٹا ہوا اور چلا ہوا ہے۔ صرف لال مسجد سلامت ہے۔ جگہ جگہ مکانوں کے بلے کے اونچے اونچے ڈھیر لگے ہیں۔ پانسون والے بازار سے لے کر رنگ محل تک بلبہ ہی مل رہی ہے۔ بلے کے نیلے بنے ہوئے ہیں۔ لوگوں کے چلتے سے ان نیلیوں پر پگ ڈنڈیاں بن گئی ہیں۔ ہم دونوں بلے کی ایک پگ ڈنڈی پر چلتے ہوئے واپس جا رہے ہیں۔ رنگ محل اور لوہاری منڈی کی طرف مکان سلامت ہیں۔ باقی سارے کا سارا رڈا میدان ہے۔ کہیں کہیں کسی مکان کی

اونچی اونچی دیواریں ابھی تک کھڑی ہیں۔ چھتیں ڈھلے چکی ہیں۔ دیواریں ایک طرف کو جھکی ہوئی ہیں۔ ہم فسادات پر باتیں کرتے جا رہے ہیں اشتقاقی کہہ رہا ہے۔

”بڑی زبردست آگ لگی ہے یہاں“

میں اسے ہٹا رہا ہوں کہ بندوؤں نے یہاں بے پناہ اسلحہ اور گولہ بارود جمع کر رکھا تھا۔ اس گولہ بارود کے پھٹنے سے یہاں زیادہ جانی نازل ہوئی ہے۔ ہم شاہ عالمی دروازے میں آ گئے ہیں۔ یہاں کوئی دروازہ نہیں ہے۔ چوک میں کسی نے ٹائر جلا کر رکھ دیا تھا جس میں سے گمراہ کالا سیاہ دھواں اٹھ رہا ہے۔ ہم بانس والے بازار میں سے گزر رہے ہیں۔ یہاں کسی دکان کو آگ نہیں لگی۔ شروع میں دونوں جانب نمک کھجوری پٹکھوں، داتن اور بارداٹنے کی دکانیں ہیں۔ ایک آدمی پوریوں جھاڑ جھاڑ کر ایک طرف لگا رہا ہے۔ گرواڑ رہا ہے۔ میں گرو سے بچنے کے لئے تیز تیز چلنے لگتا ہوں۔ آگے کھلی دکانوں کے چھوٹے چھوٹے داڑے ہیں جہاں اونچے اونچے خوبصورت بانسوں کی بھریاں دیواروں کے ساتھ لگی ہیں۔ میں ان بانسوں کو دیکھ کر خوش ہو رہا ہوں۔ مجھے برما، لٹا اور بنگال کے جنگل یاد آ رہے ہیں۔ ان جنگلوں کی تیز بھڑکوں میں بھٹکتے ہوئے بانسوں کے جھنڈ یاد آ رہے ہیں۔

بانسوں والے بازار میں کوئی رش نہیں ہے۔ کوئی سکون کوئی رکشا نہیں ہے۔ کسی وقت کوئی تانگہ گزر جاتا ہے۔ دائیں جانب ایک راستہ اندر سرائے کے کشادہ میدان کی طرف جاتا ہے۔ سرائے میں بسوں کا اڈہ ہے۔ یہاں سے ہمیں دوسرے شہروں کو جاتی ہیں۔ اس طرف سے کبھی کبھی کسی لاری کی گرگرڑ کی آواز سنائی دے جاتی ہے۔ ہم میوہپتال کے گیٹ میں داخل ہو گئے ہیں۔ ہماری منزل پاک فی ہاؤس ہے۔ مجھے میوہپتال سے پاک فی ہاؤس کی طرف جانے والا راستہ بہت

پہنڈ ہے۔ میوہپتال خاموش خاموش ہے۔ ہم بائیں جانب پکی اینٹوں والے فٹ پاتھ پر چل رہے ہیں۔ یہاں ڈاکٹروں کی دو منزلہ رہائش گاہیں ہیں۔ پرانے فیشن کی ٹھٹھے برآمدوں اور آگے کو نکلی ہوئی گیلریوں والی عمارتیں ہیں ان گیلریوں پر کہیں کہیں یوگن ویلیا کی پینٹیں چڑھی ہوئی ہیں۔ دورویہ چیل کے درخت دھوپ میں چمک رہے ہیں۔ سامنے نرسوں کے کواٹر ہیں۔ ایک سفید پوش نرس کواٹر کے باغیچے میں سے نکل کر ہسپتال کی لابی کی طرف جا رہی ہے۔ ہسپتال کے باغیچوں میں بڑا سبزہ ہے۔ کیاریوں میں پھول مسکرا رہے ہیں۔ ہوا چلتی ہے تو چیل کے پتے ادھر ادھر ہلتے ہوئے دھوپ میں ستاروں کی طرح چمکتے لگتے ہیں۔ ہسپتال کی چھتیں ہوئی ڈیوڑھی کے سامنے ہرے بھرے پلاٹ کے آگے بڑا ایک بہت عظیم الشان درخت ہے جس کے نیچے چائے کی کیکشن ہے۔ دو چار سٹوڈنٹ سفید کوٹ پہنے گھاس پر بیٹھے چائے پی رہے ہیں۔ ہم میڑھیاں اتر کر کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج والی روش پر آ جاتے ہیں جس کی دونوں جانب سرو کے درخت کھڑے ہیں۔ ایک جانب کسی بزرگ کا مزار ہے۔ مزار کے قریب سے گزرتے ہیں تو اگر تینوں کی خوشبو آتی ہے۔ اشتقاقی کہہ رہا ہے۔

”ہمارے قصبے کے باہر بھی کسی بزرگ کا ایک مزار تھا۔“

جسرات کو وہاں بڑی رونق ہوتی تھی۔ مٹی کے چراغ روشن ہوتے۔ چاروں طرف اگر تینوں کی خوشبو نہیں جھیں جائیں۔“

میڈیکل کالج کے نیلا گنبد والے گیٹ کے پہلو میں ایک پلاٹ ہوتا تھا جہاں سارے کے سارے گلاب لگے تھے۔ یہ ولایتی گلاب تھے۔ ان کی بڑی دیکھ بھال کی جاتی تھی موسم بہار میں رنگ برنگ کے گلاب کھلتے۔ یہاں زرد گلاب بھی تھے۔ اسی باغیچے میں میں نے پہلی بار وہ زرد گلاب دیکھا تھا جس کو دیکھ کر میرے ذہن میں رضیہ کی شکل ابھری تھی

جس پر میں نے اپنا ٹاؤلٹ ”زرد مگلاب“ لکھا تھا میں اور اشفاق احمد
ہائیجے میں آکر دیر تک ولایتی گلابوں کو دیکھتے رہے۔ یہاں سے ہم پاک
ٹی ہاؤس آ گئے۔

پاک ٹی ہاؤس ان دنوں ادیبوں شاعروں کا ٹی ہاؤس تھا۔ ہم لوگ
صبح سے لے کر رات گئے تک یہاں آتے جاتے رہتے تھے۔ ہماری
محفلیں لگتی تھیں۔ ٹی ہاؤس میں ہمارے دوست موجود تھے۔ میں اور
اشفاق دیوار کے ساتھ دو آدمیوں والے ٹیبل پر آکر بیٹھ گئے۔ اشفاق
احمد نے سفید فیض اور پکے نسواری رنگ کی چٹون پہن رکھی تھی۔ یہ
ہمارا کاموسم تھا۔ ٹی ہاؤس کے پکے چل رہے تھے۔ فضا میں چائے، سگار
اور سگریٹوں کی خوشبو نہیں پھیلی ہوئی تھیں۔ دیوار کے شیشے میں سے گلابی
روشنی ٹی ہاؤس میں آ رہی تھی۔ اشفاق مجھ سے امرتسر کی اور میں اس
کے قصبے اور شہر کی باتیں پوچھنے لگا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں ساتویں
جماعت میں تھا کہ کرکٹ کی ایک ٹیم کے ساتھ امرتسر سے فیروز پور شہر گیا
تھا۔ مجھے فیروز پور شہر بڑا صاف ستھرا اور خاموش خاموش شہر لگا تھا۔

”ہماری ٹیم کو ایک اسکول میں ٹھہرایا گیا تھا مجھے یاد ہے چائے
کے ساتھ ہمیں میب دیئے گئے۔ میب لال لال اور چھوٹے
چھوٹے تھے۔“

میں نے ذہنی میں سے کیپٹن کا سگریٹ نکال کر سلگایا۔ ایک سگریٹ
اشفاق کو بھی دیا۔ اس نے سگریٹ سلگ لیا۔ وہ سگریٹ کا عادی نہیں
تھا۔ محض فیشن کے طور پر کبھی کبھی سگریٹ سلگ لیتا اور دھواں بہت کم
حلق سے نیچے اُتارتا۔ میں نے اسے کہا۔

”اگر تم دھواں حلق سے نیچے نہیں لے جاتے تو پھر میرا
سگریٹ ضائع نہ کرو“

وہ ہنسنے لگا۔

”یاد رہے شرط نہ لگاؤ۔ میں کبھی کبھی مکران بھی لگا لیتا ہوں“
میرا لال چائے لے آیا۔ میں نے چائے پیا۔ ہم چائے پینے
اور باتیں کرنے لگے۔ اشفاق احمد کا سر بڑا شاندار اور ہماری بھڑک تھی۔
اس کے بھورے بھورے بال ماتھے پر لہرس بناتے ہوئے اوپر کو اٹھتے تھے
اور بڑے گھٹان تھے۔ ہم دونوں کی بھرپور نوجوانی کی عمر تھی۔ جو کرتے
وہ اچھا لگتا۔ بڑی سے بڑی چائے بھی اچھی لگتی تھی۔ نوجوان خون کی
گرمی میں گرم تھے۔ چہروں پر چمک تھی۔ بالوں میں چمک تھی۔ باتوں
میں چمک تھی۔ ایک روشنی سی تھی جس کو ہم ساتھ لے کر چلتے تھے۔ جو
ہمارے ساتھ ساتھ چلتی تھی۔

اشفاق چائے کی پیالی میز پر رکھتے ہوئے بولا۔

”یار! میں گھر جا رہا ہوں۔ شام کو ٹی ہاؤس آؤں گا۔ تم یہاں
ہو گے؟“

وہ چلا گیا۔

یہاں ایک بار پھر ماضی کے آسمان پر بادل چھا جاتے ہیں۔ پرانی
یادوں کے سٹیج کا پردہ ایک بار پھر گرتا ہے۔ بادلوں میں دھیمی دھیمی بجلی
چمکتی ہے۔ پردہ ایک بار پھر اٹھتا ہے۔ اس بار منظر گورنمنٹ کالج لاہور
— — — نہیں نہیں — — — پنجاب یونیورسٹی کے پائیں باغ کا ہے۔ میں
چھوٹے سے پائیں باغ کی روش پر سے ہوتا ہوا اشفاق احمد کی طرف
بڑھتا ہوں۔ وہ برآمدے کی میز پر اتر کر میری طرف بڑھ رہا ہے۔
کتاب اس کے ہاتھ میں ہے۔ سنہری دھوپ نکلی ہوئی ہے۔ ہم دونوں
مسکراتے ہوئے ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ اشفاق احمد کا سرخ و سپید
چہرہ روشنی لگ رہا ہے۔ وہ مسکرا رہا ہے۔ اس کے دانت چھوٹے
چھوٹے مگر ہموار اور سفید تھے۔ میں نے اشفاق کی کمر میں ہاتھ ڈال
دیا۔

”آؤ نوٹن مارکیٹ چلتے ہیں مجھے پائپ کے لئے تمباکو خریدنا ہے۔“

میں کبھی اکیلا اور کبھی کسی دوست کے ساتھ کسی نہ کسی ہمارے نوٹن مارکیٹ کا ایک پکڑ ضرور لگاتا تھا۔ اس کی وجہ نوٹن مارکیٹ کی وہ مخلوط صفائی صفائی خوشبو تھی جو وہاں فضا میں ہر طرف بسی ہوئی ہوتی تھی۔ میں جنوب مشرقی ایشیا کے ملکوں سے دیا نیا جدا ہوا تھا۔ ان ملکوں کی بارشوں کی آواز اور استوائی پھولوں کی گرم خوشبوئیں میرے ساتھ سانس لیتی تھیں۔ جب میں نوٹن مارکیٹ میں داخل ہوتا تو مجھے ایسے لگتا کہ جیسے میں رنگوں کی اسکاٹ مارکیٹ اور کولمبو کے ساحل سمندر پر بارش میں بھیگتے ناریل کے درختوں میں آگیا ہوں۔

اشفاق احمد نے سبزیوں کے مثال پر سے ایک بڑا سا نمائندہ اٹھایا۔ اسے انگلیوں میں گھماتے ہوئے غور سے دیکھ کر بولا۔

”حیدر! ایسے نمائندہ فیروز پور چھاؤنی کی دکانوں پر بہت ہوتے تھے۔ یہ دلاہتی نمائندوں کی فصل میں سے ہیں۔ ہمارے کھنڈر میں ویسی نمائندہ ہوتے تھے جو بڑے رس بھرے نازک اور سبز اور سرخ اور زرد رنگ کے ہوتے تھے۔“

مارکیٹ کی ایک دکان سے ہم نے آئرن مور کے تمباکو کا گول ڈبہ خریدا اور ہم اشفاق کے مزنگ روڈ والے مکان کے اوپر والے کمرے میں آ گئے۔ اشفاق احمد اپزل کے پاس برش لے کر کھڑا ہو گیا اور کیٹوس پر بنی ہوئی غیر مکمل آئل پینٹنگ کو غور سے دیکھنے لگا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ برش کو کیٹوس کے ساتھ لگا کر پیچھے ہٹ جاتا اور گردن ایک طرف جھکا کر غور سے کیٹوس کو دیکھنے لگتا۔ یہ بھی ایک تجربیدی تصویر تھی۔ پہلے کپیلے رنگ لگے تھے جو مجھے بڑے گندے لگ رہے تھے۔ میں نے کچھ اس قسم کا تجربہ کیا تو اشفاق برش ایک طرف رکھ کر گندے

کپڑے سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے بولا۔

”یہ اسپرٹریٹ آرٹ ہے حیدر۔ تم سیدھے سادے رومانوی رائٹر ہو۔ تم اسے نہیں سمجھ سکتے۔“

مگر میرا خیال تھا کہ اشفاق احمد بھی اسے نہیں سمجھ رہا۔ اسے بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ کیا بنا رہا ہے۔

اس زمانے کے اشفاق احمد کی ایک اور تصویر اس وقت میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ وہ یادامی رنگ کا گول گھٹے والا کرتا اور رنگین لاجپائے پاک ٹی ہاؤس میں دروازے کے ساتھ والے صوفے پر بیٹھا ہے۔ میں اس کے سامنے بیٹھا ہوں۔ قیوم نظر شہرت نقاری اور دوسرے دوست بھی موجود ہیں۔ چائے کا دور چل رہا ہے۔ بڑی گرم جوشی کے ساتھ باتیں ہو رہی ہیں۔ اس روز اشفاق لاجپائے اور کرتا پہن کر پاک ٹی ہاؤس آگیا تھا اور مجھے کاخ ہرجوت لگ رہا تھا۔ مجھے اس کا اس طرح کے لباس میں وہاں آنا اچھا نہیں لگا تھا۔ میں نے اس لباس کے بارے میں اپنے رد عمل کا اظہار بھی نہیں کیا تھا۔ اس کی مرضی ہے۔ جو چاہے پہن کر آجائے۔ لیکن مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس کے بعد اشفاق احمد کو میں نے مجھے کے جٹ کے بہروپ میں پاک ٹی ہاؤس میں پھر کبھی نہیں دیکھا۔

اشفاق احمد کے ساتھ جو میں نے ایک طویل عرصہ گزارا ہے اس کی یادیں صفائی میں پڑیں۔ ہاں کہیں کہیں سے سلسلہ ضرور ٹوٹ گیا ہے اور ایسا ہوتا قدرتی بات ہے لیکن جہاں جہاں وہ مجھے یاد ہے اس یاد کی پوری جزئیات میری آنکھوں کے سامنے ہیں۔ یہ ایک طرح ٹیگیشو ہیں میری یادوں کے جن کی تصویریں بنا کر میں اس کتاب میں چپاں کرتا جا رہا ہوں۔ جس طرح آج کل وقت گزر رہا ہے اسی طرح اس زمانے میں بھی وقت گزر رہا تھا۔ مگر ہمیں معلوم نہیں تھا۔ ہمارے لئے وقت

ایک مقام پر آکر رک گیا ہوا تھا۔ یہ مقام نوجوانی کے عروج کا مقام تھا۔ چہرے روشن تھے۔ ماتھوں پر چاند چمکتے تھے۔ کوئی چہرہ بد صورت نہیں تھا۔ کوئی آواز بے سری نہیں تھی۔ گرمیوں میں اگر درختوں کی چھاؤں میں سکون ملتا تھا تو چلتی ہوئی گرم لو بھی اچھی لگتی تھی۔ مال روڈ اتوار کو خالی خالی ہوتی تھی۔ اشفاق کے گھر کے آگے جو مزنگ روڈ صفا والا چوک کی طرف جاتی تھی اس پر کبھی کبھار ہی کوئی ٹانگہ گزرتا تھا۔ نہ کوئی رکشا تھا، نہ ویگن، نہ کوئی بس، اس زمانے کی مزنگ روڈ کی ایک فوٹو اشفاق سے میرے پاس محفوظ رہ گئی ہے۔ اس تصویر میں میرے ساتھ ہمارا مصور دوست انور جلال شمرہ بھی ہے۔ یہ فوٹو ایک فوٹو گرافر نے ہمارے پیچھے سے اتاری تھی۔ ہم لوگ اس روز اشفاق سے ملنے گئے تھے۔ کچھ دیر اس کے چوتھی منزل والے کمرے میں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ قہقہے لگاتے رہے۔ انور جلال شمرہ نے اشفاق کی میسٹنگ دیکھیں۔ تجریدی آرٹ پر کچھ بحث ہوئی۔ پھر ہم واپس چل پڑے۔ ہمارے ساتھ ہذا ایک فوٹو گرافر دوست بھی تھا۔ اس نے بجائے اس کے کہ سامنے سے آ کر ہماری تصویر بناتا ہمارے پیچھے چلا گیا اور ہم بازار میں چلے جا رہے تھے کہ اس نے تصویر اتار لی۔ آج میں اس تصویر کو کبھی کبھی صرف مزنگ روڈ کو دیکھنے کے لئے دیکھتا ہوں۔ خالی خالی مزنگ روڈ مجھے کسی اجنبی شہر کی سڑک لگتی ہے۔ تصویر میں صرف ایک ٹانگہ نظر آ رہا ہے۔ باقی ساری سڑک خالی پڑی ہے۔

ہماری محفلیں زیادہ تر پاک ٹی ہاؤس میں لگتی تھیں۔ لیکن کبھی کبھی ہم کافی ہاؤس میں بھی چلے جاتے تھے۔ میں اس لئے کافی ہاؤس جاتا کہ وہاں نفا میں رہی ہوئی کافی کی خوشبو مجھے جنوب مشرقی ایشیا کی نفاؤں میں لے جاتی تھی۔ خاص طور پر مجھے رنگون، کولمبو اور مدراس کے ریستوران یاد آ جاتے جہاں اپنی آوارہ گردی کے دوران میں بیٹھ کر

میں کافی پیا کرتا تھا۔ لاہور کے کافی ہاؤس میں زیادہ تر صفائی، وکلا اور سیاست دان ہی بیٹھتے تھے۔ شاعروں میں ریاض قادر اور ناصر کاظمی وہاں اکثر دیکھے جاتے تھے۔ مولانا چراغ حسن حسرت، ریاض قادر، سردار صادق اور بیٹ کافی ہاؤس کی محفلوں میں سب سے نمایاں نظر آتے تھے۔ یہ لوگ جس میز پر بیٹھے ہوتے وہاں دوسرے لوگ بھی کرسیاں کھینچ کر آ بیٹھتے اور ان لوگوں کی سیاسی، ادبی اور دلچسپ باتیں بڑی دلچسپی سے سنتے اور ان کی لطیفہ بازیوں سے لطف اندوز ہوتے۔ میں اور اشفاق احمد دیوار کے ساتھ والی ٹیبل پر جا کر بیٹھ جاتے۔ ہاتھ ملا کر لوگوں سے علیک سلک کرتے اور کافی پیتے ہوئے اپنی باتیں کرنے لگتے۔ سبھی ادیب اور شاعر ہرے دوست تھے۔ ہم سب سے ملتے تھے۔ سب ہم سے ملتے تھے۔ مگر ہم دونوں ایک دوسرے کے زیادہ قریب آ گئے تھے۔ ہماری بڑی بچی دوستی ہو گئی تھی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مجھے اشفاق بڑا اچھا لگتا۔ اس کی باتیں بڑی اچھی لگتیں۔ وہ پاک ٹی ہاؤس میں داخل ہوتا تو میں ہاتھ کے اشارے سے اسے اپنے پاس بلا لیتا۔ اور ہم خوب گھل مل کر مزے مزے کی باتیں کرتے۔ اسی زمانے میں اشفاق احمد نے اپنا مشہور افسانہ بلکہ طویل مختصر افسانہ ”گڈ ریا“ لکھا جس کی چاروں طرف دھوم مچ گئی۔ میں نے افسانہ پڑھا تو مجھے اشفاق سے اور زیادہ محبت ہو گئی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب نامور افسانہ نگار سعادت حسن منٹو بھی سے لاہور واپس آ چکے تھے اور مسعود پرویز کے ساتھ مل کر ایک پنجابی فلم بنا رہے تھے۔ انہوں نے بھی اشفاق احمد کا افسانہ ”گڈ ریا“ پڑھ لیا تھا اور اس سے بڑے متاثر تھے۔ منٹو صاحب کشمیری میسٹنگ کے ایک قلیٹ میں رہتے تھے۔ ایک بار میں اور اشفاق احمد ان سے ملنے گئے تو منٹو صاحب نے اشفاق کے افسانے کی تعریف کی۔ اشفاق جھینپ گیا۔ چہرہ سرخ ہو گیا اور بولا۔

”وہ تو منٹو صاحب بس۔۔۔۔“

منٹو صاحب نے عقابی آنکھوں سے اشفاق کی طرف دیکھ کر کہا۔

”بس کیا۔ اچھا افسانہ لکھا ہے تم نے۔۔۔“

پھر منٹو صاحب نے میری طرف دیکھا اور کہا۔

”تم کو اسی ہو۔ کبھی کو دیکھ کر دما شک ہو جاتے ہو“

میں نے محسوس کر لیا تھا کہ منٹو صاحب اشفاق احمد کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ اس سے میرے دل میں رشک یا حسد کا جذبہ بالکل پیدا نہیں ہوا تھا۔ یہ اشفاق احمد سے میری محبت کا کمال تھا کہ جو اس سے پیار کرتا تھا مجھے اس سے بھی پیار ہو جاتا تھا۔ میں بڑا خوش نصیب ہوں کہ خدا نے میرے دل کے سیپ میں محبت کا موتی رکھ دیا ہے۔ کوئی کسی سے محبت کرتا ہے تو میرے دل کا سیپ اپنے آپ کھل جاتا ہے اور اس کے موتی کی روشنی میرے جسم کے اندر اور باہر چاروں طرف پھیل جاتی ہے۔

ماہنامہ ”نقوش“ کا اجرا ہو چکا تھا۔ یہ اجرا کا لفظ بڑا مشکل لفظ ہے۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ رسالہ ”نقوش“ نکلنے لگا تھا۔ اس رسالے کی اپنی ایک الگ شان تھی۔ طفیل صاحب نے اپنی تمام صلاحیتیں بروئے کار لا کر اس ادبی رسالے کو بڑا معیاری اور مستند بنا دیا تھا۔ احمد ندیم قاسمی صاحب، خدیجہ مستور اور ہاجرہ مسرور اس کے عملہ ادارت کے روشن ستارے تھے۔ ”نقوش“ کا ناولٹ نمبر نکلا تو اس میں میرا ناولٹ ”جہاں برف گرتی ہے“ اور اشفاق کا ناولٹ ”صمان ہمارا“ چھپا۔ اشفاق احمد کا یہ ناولٹ بھی بہت مشہور ہوا۔ اس وقت اشفاق اپنے فن کے عروج پر تھا۔ اس کا مشاہدہ اور جزئیات نگاری حیرت انگیز تھی۔ اب میں اور اشفاق ”نقوش“ کے دفتر بھی جاتے ”نقوش“ کا دکان نما دفتر ان دونوں ایک روڈ پر ہوتا تھا۔ شیشے کی الماریوں کے

ساتھ آٹنے سانسے کرسیاں لگی ہو تھیں۔ دیوار کے ساتھ ایک میز تھا جہاں نقوش کے چیف ایڈیٹر اور مالک محمد طفیل بیٹھے تھے۔ طفیل صاحب کو قدرت نے ادب شناسی کے جوہر کے ساتھ ساتھ بڑی ہر ذریعہ قسم کی شخصیت بھی عطا کی تھی۔ وہ مختصر مگر بڑی معقول اور لودی پوائنٹ بات کرتے۔ یہاں وقار عظیم صاحب، عبادت بریلوی اور احمد ندیم قاسمی صاحب سے بھی ملاقات کا شرف حاصل ہو جاتا جو میری اور اشفاق احمد کی بڑی حوصلہ افزائی کیا کرتے تھے۔ اسی زمانے میں رسالہ ”سور“ کی جانب سے اس کے مالک اور مدیر نذیر چودھری صاحب نے لارنس باغ میں ادیبوں کو چائے کی دعوت دی۔ ”سور“ پر ترقی پسند ادب کا لیبل لگا ہوا تھا۔ گمراہی دعوت میں ان ادیبوں اور شاعروں نے بھی شرکت کی جن کا ترقی پسند تحریک سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس ٹی پارٹی کی دو تین تصویریں میرے پاس سچ بھی محفوظ ہیں ان ادیبوں میں سے بعض ہمارے دوست اور بزرگ اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں اور جو زندہ ہیں وہ ان تصویروں میں پہچانے نہیں جاتے۔ ادارہ ”نقوش“ کی جانب سے لارنس میں جو پارٹی دی گئی اس میں منٹو صاحب، وقار عظیم، عبادت بریلوی، احمد ندیم قاسمی، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، ظہیر ہابر، شوکت تھانوی اور دوسرے کئی مشہور ادیب اور شاعر شریک ہوئے۔ اس پارٹی کی مختلف تصویریں ”نقوش“ رسالے میں چھپی تھیں۔ ان میں سے ایک تصویر کافی مدت تک نمبرے پاس محفوظ رہی۔ اس تصویر میں سعادت حسن منٹو کے ساتھ میں اور اشفاق احمد کھڑے ہیں۔ یہ تصویر فوٹو گرافر نے لارنس باغ کے اوپن ایئر کینے کے اس درخت کے نیچے اتاری تھی جس کی ایک لمبی شاخ ہمارے اوپر جھکی ہوئی تھی۔ میں نے پاپ اپنی پتلون کی بیلٹ میں لگایا ہوا ہے۔ میں ان دونوں پاپ پیا کرتا تھا۔ پاکستان آ کر ہمارا ادبی سفر شروع ہو چکا تھا۔ میں اور اشفاق احمد دونوں برابر

افسانے لکھ رہے تھے۔ میں ناول اور ناولٹ بھی لکھ رہا تھا۔ اشفاق کے افسانوں کا مجموعہ "جلے پھول" چھپ گیا تھا۔ یہ کتاب بک لینڈ پبشرز کی طرف سے شائع کی گئی تھی۔ یہ اشاعتی ادارہ والی ایم سی اے ہال کی بلڈنگ میں مال روڈ کی جانب ایک لمبی دکان میں تھا۔ میرے افسانوں کا پہلا مجموعہ "منزل منزل" اور پہلا ناول "ڈربے" شائع ہو گیا تھا۔

والی ایم سی اے ہال کی دوسری منزل والے کمرے میں حلقہ ارباب ذوق کے ہفتہ وار ادبی اجلاس ہوتے۔ میں اور اشفاق بھی ان جلسوں میں شرکت کرتے۔ کبھی ترقی پسند مصنفین کے ادبی اجلاس میں شریک ہوتے۔ اشفاق احمد نے بانو قدسیہ سے شادی کر لی تھی اور وہ سن آباد کے ایک مکان میں رہنے لگا تھا۔ اب وہ نہر ایک مزنگ روڈ والے مکان سے چلا گیا تھا۔ اس کا سن آباد والا پہلا مکان چھوٹی مارکیٹ میں منزل ماڈل سکول کے سامنے تھا۔ اس مکان پر پڑے شیشے لگے تھے اور اسے شیشوں والا کواٹر کہتے تھے۔ یہاں اشفاق نے تھوڑا عرصہ ہی قیام کیا اور دوسرے مکان میں چلا گیا۔ دوسرا مکان بھی سن آباد میں گراؤنڈ کے سامنے تھا۔ اب یہ گراؤنڈ ایک باقاعدہ باغ میں تبدیل ہو چکی ہے۔ اسی زمانے میں ابھی یہاں مٹی اڑتی تھی۔ اشفاق کے گھر کے بالکل سامنے گراؤنڈ میں کجور کے تین درخت ساتھ ساتھ کھڑے تھے۔ میں انہیں تین بہنیں کما کرتا تھا۔ میں اکثر اشفاق سے ملنے یہاں آتا تھا۔ ایک بار میں نے مزنگ میں اپنے ایک واقف کار سے ملنے گیا۔ وہ گھر پر نہیں تھا۔ گرمیوں کی دوپہر تھی۔ بڑی سخت گرمی پڑ رہی تھی۔ لو بھی چل رہی تھی۔ مگر مجھے یہ سب کچھ اچھا لگ رہا تھا۔ میں تانگے میں سے مزنگ تک آیا تھا۔ جب مجھے میرا واقف کار نہ ملا تو میں پیدل ہی سن آباد کی طرف چل پڑا۔ آج کل اس سڑک پر پیدل چلنا نرال ہے۔ آدمی رکشاؤں اور گاڑیوں کے درمیان پھنس جاتا ہے۔ مگر

پاکستان کا شروع شروع کا زمانہ تھا۔ سن آباد کے این ٹائپ کواٹروں کی قطاریں ہی ابھی تعمیر ہوئی تھیں۔ نئے مزنگ سے سن آباد کی طرف جاتی سڑک خالی خالی تھی۔ ایک طرف قبرستان تھا۔ مجھے یاد ہے میں نے بوسکی کی قبض کے ساتھ گرے درمٹ کی چٹون اور سرشوز پہن رکھے تھے۔ میں پیدل چلتا سخت گرمی میں اشفاق احمد کے گھر پہنچ گیا۔ یہ این ٹائپ کا مکان تھا۔ میں چھوٹی سی گلی میں سے گزر کر مکان کے عتقی صحن میں گیا۔ بانو قدسیہ باورچی خانے میں چوکی پر بیٹھی روٹیاں پکا رہی تھیں۔ میں اور اشفاق احمد دیوان خانے میں آکر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر میں بانو قدسیہ میرے لئے آکس کریم لے آئی۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ کیونکہ اس وقت مجھے آکس کریم کی سخت ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ میں سہ پہر تک اشفاق کے ساتھ رہا۔ ہم دونوں مکان کے برآمدے میں بیٹھے خدا جانے کیا باتیں کرتے رہے۔ اب وہ باتیں مجھے یاد نہیں ہیں۔ ہمارے سامنے سڑک پر ٹافلی کے درخت گرمیوں کی گرم سہ پہر میں سر جھکائے خاموش کھڑے تھے۔

اس وقت مجھے معلوم نہیں تھا کہ شادی کے بعد مجھے بھی اسی علاقے میں آکر آباد ہونا ہے۔ آج کل میں سن آباد میں ہی اپنے مکان میں رہ رہا ہوں۔ میرا یہ مکان اشفاق احمد کے سن آباد والے مکان سے قریب ہی ہے۔ صبح میر کر لے جاتا ہوں تو روزانہ اشفاق کے مکان کے سامنے سے گزرتا ہوں اور مجھے وہ زمانہ یاد آ جاتا ہے۔ اب یہ گراؤنڈ بڑے اچھے باغ میں تبدیل ہو چکی ہے۔ ساتھ ساتھ آگے ہوئے کجور کے تینوں درخت غائب ہو چکے ہیں۔ وہ درخت وہ تین بہنیں مجھے بڑی یاد آتی ہیں۔ ان کی جگہ باغ میں نئے نئے درخت لگ گئے ہیں۔ تقریباً یہ سارے درخت میرے سامنے لگے تھے اور میرے سامنے جوان ہوئے ہیں۔ اب سب سے میری دوستی ہے۔ ان درختوں میں سنبل اور

یو کپش کے درخت زیادہ ہیں۔ سنبل کے ایک درخت سے میری اس کے بچپن کے زمانے سے دوستی ہے۔ اب یہ درخت جوان ہو چکا ہے۔ منہ اندھیرے جب میں ستاروں کی دھندلی روشنی میں اس درخت کے پاس آتا ہوں تو وہ بڑا خوش ہوتا ہے۔ ہم خاموش زبان میں باتیں کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کا حال پوچھتے ہیں اور میں میر کرتے ہوئے آگے نکل جاتا ہوں۔

اب اشفاق احمد نے ایک سائیکل خرید لی تھی۔ وہ سائیکل پر سمن پلاو سے پاک فی ہاؤس اور ریڈیو شیشن آتا۔ ہم دونوں ریڈیو پاکستان لاہور کے ساتھ بطور سٹاف آرٹسٹ منسلک ہو چکے تھے۔ میرا مکان ان دنوں فلمنگ روڈ پر تھا۔ میں لاہور ہوٹل والی سڑک پر سے ہوتا ہوا قلعہ سبھ سنگھ سے نکل کر ایبٹ روڈ پر آتا تو یہاں کبھی کبھی اشفاق سے ملاقات ہو جاتی وہ سائیکل پر سوار ریڈیو شیشن کی طرف جا رہا ہوتا۔ فکر وہ مجھ سے تھوڑا آگے نکل گیا ہوتا تو میں اسے تواز دے کر روک لیتا۔ کبھی وہ مجھے جاتا دیکھ کر میرے پاس سکر سائیکل سے اتر جاتا اور ہم دونوں باتیں کرتے شملہ پہاڑی کی طرف چل پڑتے۔ جہاں اب لاہور ٹیلی ویژن سنٹر کی عمارت کھڑی ہے۔ یہاں ان دنوں ایک ویران سے اجاڑے میں ایک چھوٹی سی گاڑی ناپرائی کو غصی ہوا کرتی تھی۔ چاروں طرف تاروں کی پاڑھ لگی تھی۔ سڑک کی جانب اندر جاتے کچے راستے پر ایک تختی لگی تھی جہاں کسی بہر صاحب کا نام لکھا تھا۔ میں وہ نام بھول گیا ہوں۔ یہاں کبھی کبھی ایک دو فونی نے بھرتی ہونے والے جوانوں کی چھاتی اور قد کا ناپ لیتے بھی نظر آ جاتے تھے۔ اس اجاڑے کے ایک کونے میں الماس کا ایک درخت ہوا کرتا تھا۔ گرمیوں میں ان درختوں پر زرد پھول آتے۔ ان پھولوں کے زرد فالوس دیکھنے کے لئے میں اور اشفاق تھوڑی دیر کے لئے رک جاتے تھے۔ پرانا ریڈیو شیشن شملہ پہاڑی کے پیچھے پرانے زمانے کی ایک نیم شلکھ کو غصی میں تھا۔ اس کے گہراج میں ریڈیو کی کینٹین تھی۔ علم و ادب اور دنیا کے موسیقی کی بڑی بڑی اہم شخصیتیں اس ٹوٹی ہوئی کرسیوں والی کینٹین

میں بیٹھ کر چائے پیا کرتی تھیں۔

اسی ایبٹ روڈ پر ایک بار میں اکیلا ٹا بلیوں کے درختوں کے نیچے سے ہوتا ریڈیو سٹیشن کی طرف جا رہا تھا کہ پیچھے سے آکر اشفاق سائیکل سے اتر گیا اور ہم بائیں کرتے چلے گئے۔ اس نے کہا۔

”میں ریڈیو سے ایک سلسلہ وار منچر شروع کرنے والا ہوں جو ایک ایسے بزرگ کے بارے میں ہو گا جو دوسروں کو بڑی نصیحتیں کرتا ہے مگر خود ان پر کبھی عمل نہیں کرتا۔ بلکہ اس کا عمل ان نصیحتوں کے بالکل الٹ ہوتا ہے۔ میں نے اس کا نام ”تلقین شاہ“ سوچا ہے۔ کیا خیال ہے؟“

میں نے اسے جواب دیا تھا۔

”یہ کام تم بہت اچھا کر لو گے کیونکہ تم بھی دوسروں کو بڑی ہدایتیں دیتے رہتے ہو۔“

یا تو اشفاق احمد کا مزاج ہی ایسا ہے اور یا پھر وہ واقعی دوسروں کا بھلا چاہتا ہے۔ کیونکہ میں نے دیکھا ہے کہ وہ دوسروں کو نیکی کی بڑی تلقین کرتا ہے۔ بڑی کارآمد ہدایتیں دیتا ہے۔ بھرپور جوانی کے دنوں میں بھی میں نے اس کی زبان سے کوئی گالی یا گناہ کی بات شاید ہی کبھی سنی ہو۔ یہ میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ باتیں کرنے میں وہ بڑا ماہر ہے۔ قدرت یہ عطیہ کسی کسی کو عطا کرتی ہے۔ اس زمانے میں بھی اس کا حلقہ اثر وسیع ہو گیا تھا اور وہ ایک آدمی ہر وقت اس کی خدمت کے لئے تیار رہتے تھے۔ سماجی حیثیت سے اشفاق احمد کا کردار شروع ہی سے بے داغ رہا ہے۔ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے اس نے نہ تو کبھی کسی کو قرض دیا ہے اور نہ کسی سے قرض لیا ہے۔ منٹو کی طرح اس نے شراپیں بھی نہیں پیں۔ میری طرح اس نے عشق معاشقے بھی نہیں کئے۔ ایسا آدمی ہمارے روایت پرست معاشرے میں اپنا حلقہ اثر پیدا کرنے میں بڑی آسانی سے کامیاب ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اشفاق بھی اس معاملے

میں بڑا کامیاب تھا اور ہے۔ شراب نہ پینے اور عورتوں سے عشق نہ کرنے کو میں کوئی خوبی نہیں سمجھتا۔ اگر آپ اسے خوبی سمجھتے ہیں میری رائے میں اشفاق میں یہ خوبیاں اس لئے پائی جاتی ہیں کہ وہ ”بے کزور آدمی“ ہے۔ اس کے جذبے بھی کمزور ہیں اور اس کا معدہ بھی شروع سے کمزور رہا ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ میں خوب شراب پیا کرتا تھا۔ ایک روز ہم شملہ پہاڑی کی طرف سے اسیلی ہال کی طرف آرہے تھے۔ اشفاق نے نئی نئی گاڑی خریدی تھی۔ ابھی شراب پر پابندی نہیں لگی تھی اور مال روڈ پر انگلش وائمن کی دکان ہوا کرتی تھی۔ اشفاق گاڑی سیدھی پلازا سینما کی طرف نکالے لگا تو میں نے اسے کہا۔

یہاں سے وائمن جانب گاڑی موڑ لو اور انگلش وائمن سے مجھے جم خانے کا کواٹر لے کر دو۔“

اشفاق نے گاڑی وائمن جانب ہال پر کر لی اور کہنے لگا۔

”میں گاڑی میں ہی بیٹھوں گا۔ تم جا کر لے آؤ۔“

وہ گاڑی میں ہی بیٹھا رہا۔ میں نے گاڑی سے اترتے ہوئے کہا۔

”تمہارے لئے میری بوتل لے آؤں؟ گرمی بڑی پڑ رہی ہے۔“

وہ کانوں کو ہاتھ لگانے لگا۔ ”توبہ توبہ۔“

نوجوانی کے زمانے میں بھی اسے گیس کی ٹربل تھی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ ہرالا بلا چیز ہر وقت کھا لیتا تھا۔

پرانے ریڈیو سٹیشن کا زمانہ ہماری یادی و دستی کا بڑا خوبصورت اور ابتدائی زمانہ تھا۔ لباس کے بارے میں وہ لاپرواہ رہا ہے۔ مگر اس کی شخصیت میں بڑی کشش ہوا کرتی تھی۔ ہڈ کاٹھ بھی مضبوط تھا۔ خوبصورت بھی تھا۔ بطور افسانہ نگار وہ مشہور بھی ہو گیا ہوا تھا۔ مگر لڑکیوں سے محبت کرنے کے معاملے میں وہ بہت پیچھے تھا۔ میں دیکھا کرتا کہ عورتوں کے ساتھ ”خاص طور پر“ لڑکیوں کے ساتھ اس کا رویہ بڑا مشفقانہ ہوتا تھا۔ یعنی وہی ہدایتیں اور تلقین

— ایک لحاظ سے یہ اچھی بات بھی تھی۔ کم از کم وہ عشق کی بک بک سے بچ گیا تھا۔ کنواری شریف زادوں کی طرح اسے بھی اپنی بدنامی اور نیک نامی کا بہت زیادہ خیال لگا رہتا تھا۔

ایک بار مجھے ایک لڑکی نے کہا کہ اگر مجھ سے ملنا ہے تو رات کے ٹھیک بارہ بجے ہماری کونٹھی کی عقبی دیوار پھانڈ کر آ جاؤ۔ میں نے فوراً کہا۔ آ جاؤں گا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اشفاق احمد لیل و نہار کا ایڈیٹر ہوا کرتا تھا۔ میں اس کے دفتر میں بیٹھ کر اس لڑکی سے فون پر باتیں کیا کرتا تھا۔ میں نے اشفاق سے کہا کہ میں سب رات اس لڑکی کے گھر دیوار پھانڈ کر جا رہا ہوں۔ اشفاق احمد نے لکھتے لکھتے قلم رکھ دی اور میری طرف گھور کر دیکھتے ہوئے کہا۔

”کیسے! اس حرکت سے باز آؤ۔ اگر پکڑے گئے تو جانتے ہو کتنی بے عزتی ہوگی۔ تمہارے سسرال والے کیا کہیں گے؟“

میں نے کہا۔

”اس لڑکی نے مجھے چھیڑ چھا کر دیا ہے کہ اگر ملنا ہے تو رات کو دیوار پھانڈ کر آ جاؤ۔ اب میں پیچھے ہٹا تو یہ میری بے عزتی ہے۔“

اشفاق نے مجھے برا سمجھایا۔ ڈانٹا۔ برا بھلا بھی کہا بڑی ہدایتیں کیں۔ مگر میں اپنی جگہ پر قائم رہا۔ میں دن کے وقت جا کر کونٹھی کی دیوار کا جائزہ لے آیا۔ دیوار ڈیڑھ مردانہ جی تھی۔ اس پر میں صرف کسی دوست کے کانٹوں پر پاؤں رکھ کر ہی چڑھ سکتا تھا۔ اس کام کے لئے میں نے ابنِ انشاء کا انتخاب کیا۔ اس سے بات کی تو وہ بڑا خوش ہوا۔ کہنے لگا۔

”میں بھی تمہارے ساتھ دیوار پھانڈوں گا۔“

رات کے بارہ بجے تک میں اور ابنِ انشاء مال روڈ پر پھرتے رہے۔ اس کے بعد ہم مذکورہ کونٹھی کی طرف گئے اور میں اس کے کانٹوں پر پاؤں رکھ کر دیوار پر چڑھ گیا اور دوسری طرف چھانگ لگا دی۔ بہر حال دوسرے دن میں نے اشفاق کو رات کی داستان سنائی تو اس نے ایک بار پھر مجھے ڈانٹا اور

کہا۔

”کانٹوں کو ہاتھ لگاؤ۔ آئندہ یہ حرکت نہیں کرنا گے۔“

میں نے اس کے سامنے کانٹوں کو ہاتھ لگا دیا۔

— ابھی میں آپ کو پرانے ریڈیو شیشن کے زمانے کی باتیں ہی سنانا چاہتا

ہوں۔ وہ بڑا خوبصورت اور بھرپور جذبوں کا زمانہ تھا۔ اشفاق احمد نے ریڈیو پر

”تلقین شاہ“ کی میریز شروع کر دی۔ ایک تو وہ بڑا اچھا صوبہ تھا۔ دوسرے اس

نے ”تلقین شاہ“ کا کردار خود ادا کیا۔ یہ سونے پر سہاگہ والی بات ہو گئی۔ پہلے

براؤ کاسٹ پر ہی ”تلقین شاہ“ مشہور ہو گیا۔ اشفاق نے اپنے پنجابی لہجے میں

زودھک حصار کا لہجہ شامل کر لیا تھا۔ جو لوگوں میں بڑا مقبول ہو گیا۔ ایک بار

اشفاق نے مجھے بتایا تھا کہ لوگ اسے زودھک حصار کا لہجہ سمجھتے ہیں۔ اصل میں

یہ ہوشیار پور کے گرد و نواح کا لہجہ ہے۔ ہو سکتا ہے ایسا ہی ہو۔ مگر یہ حقیقت

ہے کہ اشفاق احمد جب اس لہجے میں ریڈیو پر بولتے تو تلقین شاہ کا کردار زندہ

ہو کر ہماری آنکھوں کے سامنے آ جاتا۔ اس کا یہ فیچر جرج بھی کبھی کبھار اسلام

آباد ریڈیو سے سننے میں آ جاتا ہے۔ یہ فیچر مجھے اس وقت بھی بہت پسند تھا اور

آج بھی میں اسے بڑے شوق سے سنتا ہوں۔ اگر میں لکھ رہا ہوں تو کام

چھوڑ دیتا ہوں۔ ”تلقین شاہ“ کے علاوہ اشفاق ریڈیو کے لئے ڈرامے بھی

لکھتا۔ مختلف موضوعات پر تقریریں بھی نشر کرتا اور اوپ کے میدان میں بھی

وہ منزلوں پر منزلیں طے کرتا جا رہا تھا۔ اس کی شہرت میں روز بروز اضافہ ہو رہا

تھا۔ اس کا حلقہ اثر وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا۔ لیکن اس کے دوستوں کا

حلقہ مجھے اور دو ایک اور ادیبوں کو نکال کر زیادہ تر غیر ادبی لوگوں پر مشتمل

تھا۔ میرا تو اصلاً جیٹنا اپنے شاعر اور اوپ دوستوں میں تھا جبکہ اشفاق احمد کا

اپنا الگ حلقہ پاراں تھا۔ شاعروں ادیبوں سے اس کی ملاقات خاص خاص

نکشن میں ہی ہوتی تھی۔ قلندرانہ شان والے شاعروں اور ادیبوں سے اشفاق

بڑا غلط ہو کر ملتا۔ اس زمانے میں ہی اشفاق احمد بڑا پھونک پھونک کر قدم

رکھنے کا عادی تھا۔ اسے اپنے سوشل سٹینس کا بروقت بڑا خیال رہتا تھا۔ اس کا زیادہ اہمنا بیٹھنا سرکاری افسروں کے ساتھ ہو گیا تھا۔ انہیں شاعروں میں بھی ان انہیں شاعروں سے وہ بڑا خوش ہو کر ملتا جو سرکاری افسر تھے۔ اس کی یہ بات مجھے اس لئے بھی اچھی نہیں لگتی تھی کہ وہ مجھ سے دور ہو جاتا تھا۔

ابن انشاء تو پھر بھی ایک بار میرے ساتھ میرا منڈی کی سیر کرنے چل پڑا تھا مگر اشفاق احمد کا تو وہاں جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں نے اسے کبھی میرا منڈی گانا سننے یا یونی سیر کرنے جانے کے لئے کہا بھی نہیں تھا۔ کیونکہ میرے حساب سے وہ اس ماحول کا آدمی نہیں تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر میں اسے زبردستی کبھی میرا منڈی لے جاتا تو میرا منڈی کے ماحول کو سخت تکلیف ہوتی۔ اپنا اپنا ماحول ہوتا ہے۔ اپنی اپنی تکلیف ہوتی ہے۔ جس کو قدرت نے جس ماحول کے لئے پیدا کیا ہے اسے اسی ماحول میں رہنا چاہیے۔

اب میں آپ کو اشفاق احمد کے ایک رومان کی کہانی سناتا ہوں۔ لیکن یہ ایک طرفہ رومان تھا۔ یعنی لڑکی کو اشفاق احمد سے محبت تھی اشفاق احمد کا اس سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں تھا۔

یہ پرانے ریڈیو سٹیشن کے زمانے کی بات ہے۔ مجھے یاد نہیں رہا اشفاق احمد کا کوئی افسانہ ادب لطیف یا شاید کراچی کے کسی پرچے میں چھپا اس افسانے کا پڑھ کر ایک لڑکی اشفاق احمد سے محبت کرنے لگی۔ یہ لڑکی لاہور کے ایک کالج کی سٹوڈنٹ تھی۔ میں اس کا اصلی نام نہیں لکھوں گا۔ کالج کا نام بھی نہیں لکھوں گا۔ آپ اس کا کوئی نام رکھ لیں۔ میں خالہ رکھ لیتے ہیں۔ اشفاق کو اس قسم کے پرانے نام پسند بھی ہیں۔ ایک دن کی بات ہے۔ میں پرانے ریڈیو سٹیشن پر آیا تو مجھے کسی پروڈیو سر نے بتایا کہ اشفاق صاحب آئے ہوئے ہیں۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ میں نے اسے ریڈیو سٹیشن کے تمام کمروں اور سٹوڈیو میں دیکھا مگر وہ مجھے کہیں نظر نہ آیا۔ میں نے سوچا کہ سنین میں چل کر دیکھنا چاہیے۔ وہاں آیا تو میں نے دور سے دیکھا کہ اشفاق ایک لڑکی کے

پاس بیٹھا ہے۔ لڑکی چائے بنا رہی ہے اور وہ کسی بات پر ہنس رہا ہے۔ میرے لئے یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ کالج کی لڑکیاں 'معزز خواتین' اور ریڈیو کی آرٹسٹیں وغیرہ اکثر اشفاق کے پاس دیکھی جاتی تھیں۔ اشفاق نے مجھے دیکھا تو اشارے سے بلا لیا۔ میں قریب گیا تو کہنے لگا۔

"آؤ آؤئے کشمیری تم بھی چائے پیو۔"

پھر اس نے لڑکی سے میرا تعارف کرایا۔ اس لڑکی کا نام خالہ تھا اور وہ لاہور کے ایک کالج میں بی۔ اے یا شاید ایف۔ اے کی سٹوڈنٹ تھی۔ بڑی شریف سادہ سی لڑکی تھی۔ اس زمانے میں قمری رنگ کے نیڈی کپڑوں کا عورتوں میں بڑا فیشن تھا۔ مگر اس لڑکی کا لباس نیڈی نہیں تھا۔ سر پر دوپٹہ لیا ہوا تھا۔ شکل و صورت اچھی تھی۔ وہ سر جھکائے چائے بنا رہی تھی۔ اشفاق نے میرا تعارف کرایا تو لڑکی نے چہرہ اٹھا کر تھوڑی دیر کے لئے میری طرف دیکھا اور دوبارہ چائے بنانے میں مصروف ہو گئی۔ وہ چائے اس اہتمام سے بنا رہی تھی جیسے کسی مریض کے لئے نسخے کے مطابق دوا تیار کر رہی ہو۔ میں نے کوئی زیادہ اہمیت نہ دی۔ اور اشفاق سے کسی پروگرام کے بارے میں باتیں کرنے لگا۔

میں نے محسوس کیا کہ اشفاق احمد میری باتوں پر زیادہ دھیان نہیں دے رہا۔ میری بات پر ہوں ہاں کہہ کر وہ اس لڑکی کی طرف متوجہ ہو جاتا۔ لڑکی کے ساتھ اس کا انداز بڑا مریانہ اور مشفقانہ تھا۔ یہ بھی میرے لئے کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ لیکن میں نے ایک بات خاص طور پر نوٹ کی کہ اشفاق احمد لڑکی سے باتیں کرتے کرتے کچھ نروس سا ہو جاتا ہے۔ یہ ضرور انوکھی بات تھی۔ کیونکہ میں نے اسے کبھی کسی عورت کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے نروس ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ پھر بھی میں نے کوئی زیادہ خیال نہ کیا۔ لڑکی یعنی خالہ افسانوں 'افسانہ نگاروں' ریڈیو کے پروگراموں اور درسی کتابوں کے بارے میں باتیں کرتی رہی۔ پھر وہ اجازت لے کر چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد اشفاق

احمد نے دونوں ہاتھ اپنے چہرے پر پھیرے اور چائے کا لبا گھونٹ بھرنے کے بعد بولا۔

”یار! یہ لڑکیاں بھی عجیب ہوتی ہیں“

میرے کان کھڑے ہو گئے۔ میں نے پوچھا۔

”کیوں؟ کوئی خاص بات ہوئی ہے؟“

اشفاق اپنے مخصوص انداز میں فسن پڑا۔ کہنے لگا۔

”اونہیں کیئے! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“

میں نے سگریٹ کا دھواں چھوڑتے ہوئے کہا۔

”مجھے پتہ ہے ایسی بات ہو ہی نہیں سکتی“

اشفاق نے موضوع بدل دیا۔ ہم ریڈیو پروگراموں کے بارے میں باتیں

کرنے لگے۔ جاسن کے درختوں کے بارے میں باتیں کرنے لگے جو ریڈیو

سٹیشن کی کوٹھی کے پہلو میں دیوار کے ساتھ کھڑے تھے۔ ایک ہفتہ گزر گیا۔

خالدہ کا نہ مجھے خیال آیا نہ اشفاق نے اس کا کوئی ذکر کیا۔ ایک دن میں ریڈیو

سٹیشن آیا تو عادت کے مطابق سیدھا کینٹین کی طرف چل دیا۔ کیونکہ وہاں مجھے

میرے میوزیشن دوستوں میں سے کوئی نہ کوئی مل جاتا تھا اور میری خواہش

ہوتی تھی کہ ریڈیو سٹیشن پر چائے کی پہلی پیالی کسی شہر کے گیلانی کے ساتھ

پیوں۔ اشفاق روز نہیں آتا تھا۔ ورنہ اس کے ساتھ چائے پی کر مجھے بڑی

خوشی ہوتی تھی۔ کیونکہ وہ میرا شروع ہی سے بے تکلف یار بن گیا تھا۔ اور پھر

مجھے وہ بڑا اچھا لگتا تھا۔ بلکہ میں یہ کہوں گا کہ مجھے اس سے پیار ہو گیا تھا۔ یہ

پیار آج بھی اسی شدت کے ساتھ قائم ہے اور آج بھی میری خواہش ہوتی ہے

کہ کہیں سے کوئی گاڑی مل جائے تو میں اشفاق کے گھر جاؤں اور اس کے

ساتھ بیٹھ کر چائے پیوں۔ باتیں کہوں۔ اس کی باتیں سنوں اور پھر واپس آ

جاؤں۔ یہ محبت کے معاملات ہیں اور ان معاملات کو صرف محبتیں کرنے

والے ہی سمجھ سکتے ہیں۔ دوستیاں کرنے والے نہیں سمجھ سکتے۔ اور میں بنیادی

طور پر محبت کا آدمی ہوں۔ دوستی بھانے کی مجھے آج تک سمجھ نہیں آئی۔ جتنے

دوست بنائے۔ سب ایک ایک کر کے میرے دشمن بن گئے۔

میں پھر محبت کی طرف آتا ہوں۔ میں نے دیکھا کہ ایک لڑکی ریڈیو کی

کینٹین میں کونے والی گول میز کے سامنے کرسی پر بیٹھی کوئی کتاب پڑھ رہی

ہے۔ میں واپس مڑنے لگا تو مجھے خیال آیا کہ یہ وہی لڑکی ہے جو ہفتہ پہلے

اشفاق سے ملنے آئی تھی۔ میں آہستہ آہستہ چل کینٹین میں آیا تو دیکھا کہ وہ

خالدہ ہی تھی۔ وہ کتاب پڑھنے میں منہمک تھی۔ میں نے کہا۔

”آپ کو اشفاق صاحب سے ملنا ہے؟“

خالدہ نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا اور کرسی چھوڑ کر کھڑی ہو گئی اس نے

مجھے سلام کیا اور پوچھا۔

”کیا اشفاق صاحب آگئے ہیں؟“

میں کرسی کھینچ کر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

”وہ تو ہفتے میں دو ایک بار آتا ہے اور وہ بھی زیادہ تر شام کو۔ پتہ

نہیں۔ شاید آجائے۔“

میں نے چائے کا آرڈر دیا تو وہ جلدی سے بولی۔

”جی نہیں شکریہ۔ میں چائے نہیں پیوں گی۔“

”تھوڑی سی پی لیں۔ کوئی بات نہیں۔ شاید اشفاق آجائے“

اس نے کتاب بند کر دی اور کینٹین کی پھست کی طرف نگاہیں اٹھا کر

جائزہ لیا اور بولی۔

”یہ لوگ صفائی کا خیال کیوں نہیں رکھتے؟“

میں نے سگریٹ سلگایا۔ اس زمانے میں میں کینٹین سگریٹ پیا کرتا تھا

جو بڑا اچھا سگریٹ ہوتا تھا۔ میں اس بے کالج کی پڑھائی کی باتیں کرنے لگا۔ وہ

زیادہ تر میری باتوں کا مختصر سا جواب دیتی۔ اس کی نظریں بار بار وہاں سے نظر

آنے والے ریڈیو سٹیشن کے آہنی گیٹ کی طرف اٹھ رہی تھیں جو اگرچہ بند

تھا مگر اس کی سلاخوں میں سے باہر سڑک پر آتے جاتے لوگ صاف نظر آرہے تھے۔ یقیناً وہ اس انتظار میں تھی کہ شاید اشفاق آجائے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا اسے اشفاق سے کوئی ریڈیو کے بارے میں کام ہے؟ اس نے مسمکراتے ہوئے کہا۔

”جی نہیں۔ دراصل مجھے ان کے ایک افسانے کے بارے میں کچھ معلومات چاہیے تھیں۔“

اس کے انداز سے صاف لگ رہا تھا کہ وہ اصل بات کو چھپانے کی کوشش کر رہی ہے۔ میں نے زیادہ کریدنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ چائے آگئی۔ وہ چائے بنانے لگی تو میں نے اسے روک دیا اور کہا کہ میں بناتا ہوں۔ کیونکہ میرا تجربہ تھا اور تجربہ ہے کہ ہمارے ہاں کی 95 فی صد خواتین کو چائے بنانی نہیں آتی۔ جو پانچ فی صد اچھی چائے بناتی ہیں ان سے کہیں سو دو سو سال کے بعد جا کر ملاقات ہوتی ہے۔ ہم چائے پیتے رہے اور ادھر ادھر کی باتیں بھی کرتے رہے۔ اشفاق نہ آیا۔ خالدہ چلی گئی۔ دوسرے روز اشفاق سے ملاقات ہوئی تو میں نے اسے کہا کہ خالدہ تم سے ملنے آئی تھی۔ وہ ہنس پڑا۔

”وہ کیوں آئی تھی؟“

میں نے کہا۔

”وہ تمہارے کسی افسانے کے بارے میں تم سے کوئی بات پوچھنا چاہتی تھی۔“

اشفاق کے چہرے پر سرفی آگئی۔ وہ کچھ جھینپ سا گیا۔ میں نے اسے گھور کر دیکھا۔ اور کہا۔

”جلدی سے مجھے خوش خبری سناؤ کہ تمہیں اس سے محبت ہو گئی ہے۔“

اشفاق نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور بولا۔

”او نہیں یار۔ ہمیں کہاں کسی سے محبت ہو سکتی ہے۔“

میں نے کہا۔

”چھا تو پھر خدا کے لئے اس سے ضرور مل لو۔ وہ تم سے ملنے کو سخت بے تاب تھی۔ مجھے تو لگتا ہے۔ وہ تم سے محبت کرنے لگی ہے۔“

اشفاق میری طرف جھکا پھینکی سی ہنسی ہنسنے لگا۔

”او نہیں یار۔ تم احسن ہو۔ تم ان بھولی بھالی لڑکیوں کو نہیں جانتے بس انہیں کوئی نہ کوئی کمپلیکس ہو جاتا ہے۔ چلو اوپر چلنے میں شاو امیر تسری کے پاس۔“

میں نے کہا۔ ”چائے آرہی ہے۔“

وہ اوپر جانے والے زینے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

”اسے کچھ اوپر لے آئے۔“

اشفاق احمد ابھی تک۔ یمن آباد والے گھر میں نہیں آیا تھا۔

ایک روز کی بات ہے کہ میں پاک ٹی ہاؤس میں اپنے شاعر ادیب

دوستوں کے ساتھ بیٹھا تھا کہ کلاؤن پر رکھے ٹیلی فون کی کھنٹی بجی۔ علیم صاحب

نے میری طرف دیکھ کر اشارہ کیا کہ تمہارا فون آیا ہے۔ یہ فون خالدہ نے کیا

تھا۔ پہلے تو میں نے اس کی آواز نہ پہچانی۔ جب اس نے بتایا کہ میں خالدہ بول

رہی ہوں تو میں نے پہلا سوال یہ کیا کہ خیریت ہے؟ کہنے لگی۔

”مجھے آپ سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔“

میں نے کہا۔

”کوئی خاص بات ہے کیا؟“

”جی نہیں۔“ خالدہ کی ہنسی کی گواہ تھی۔

میں نے کہا۔

”پاک ٹی ہاؤس آجائے۔ میں اس وقت یہیں بیٹھا ہوں۔“

وہ کہنے لگی۔

”نہیں۔ یہاں نہیں۔ آپ ایسے کیوں نہیں کرتے۔ تھوڑی دیر کے لئے لارنس بارغ والے اوپن ایئر کیفے میں آجائیں۔ میں بھی کالج سے وہاں آجاتی ہوں۔“

میں نے گھڑی دیکھ کر کہا۔

”ٹھیک ہے۔ چندر منٹ بعد پہنچ رہا ہوں“

چندر منٹ بعد میں لارنس بارغ میں تھا۔ بہار کا موسم تھا۔ یعنی اپریل شروع ہو چکا تھا۔ پھول کھل رہے تھے۔ فضا میں سبزے اور پھولوں کی ملی جلی خوشبوئیں پھیلی ہوئی تھیں۔ روشن روشن دھوپ چاروں طرف نکلی ہوئی تھی۔ فضا میں ہلکی ہلکی گرما بخش تھی جو جسم کو بڑی اچھی لگ رہی تھی اور کیپشن کے سگریٹ کا مزہ دہلا ہوا گیا تھا۔ لارنس بارغ کے اوپن ایئر کیفے میں ایک سبز رنگ کا لکڑی کا کینبن ہوا کرنا تھا۔ اس کی کھڑکی کھلی رہتی تھی۔ خالدہ مجھے کھڑکی میں سے اندر بیٹھی نظر آئی۔ میں کینبن میں آگیا۔

خالدہ نے کھڑکی کا پردہ کھول دیا۔

کہنے لگی۔

”میں کالج سے آرہی ہوں۔ آج دوپہر خالی تھی۔“

اس کی دو کتابیں اور ایک کاپی میز پر پڑی تھی۔ میرا آیا۔ میں نے اسے چائے کا آرڈر دیا اور موسم کے بارے میں دو تین باتیں کرنے کے بعد پوچھا۔

”اب بتاؤ کیا بات ہے؟“

خالدہ کے چہرے پر حیا کی سرخی سی دوڑ گئی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ معہ کیا ہے۔ اتنا ضرور مجھے شک ہو گیا تھا کہ یہ لڑکی اشفاق کو اچھا سمجھتی ہے اور کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر اس سے ملنے ریڈیو سٹیشن آجاتی ہے۔ کہنے لگی۔

”کوئی خاص بات نہیں ہے۔ بس آپ سے یہی پوچھنا تھا کہ اشفاق

صاحب تو بڑے مصروف آدمی ہیں۔ ان سے ملاقات ہی نہیں ہوتی۔ فون پر بھی نہیں ملتے۔ آپ ہی مجھے ان کے افسانوں کے بارے میں کچھ بتادیں۔ دراصل میں ان پر ایک مضمون لکھنا چاہتی ہوں۔“

معہ حل ہو گیا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ اصل بات کیا ہے۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”بی بی! جو بات تمہارے دل میں ہے اور جسے تم مجھ سے چھپا رہی ہو وہ بتاؤ۔“

خالدہ چپ ہو گئی۔ اس کے چہرے پر گہری متانت آگئی۔ میرا چائے رکھ کر چلا گیا۔ وہ چائے پنانے لگی تو میں نے اسے روک دیا۔

”میں بتاتا ہوں۔ تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔“

وہ کتاب کھول کر اس کے ورق الٹتے ہوئے بے نیازی سے بولی۔

”نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ بات اصل میں یہ ہے کہ مجھے

اشفاق صاحب کے افسانے بہت اچھے لگتے ہیں۔“

”اور اشفاق صاحب؟“ میں نے بات کاٹ کر پوچھا۔ خالدہ منہ دوسری

طرف کر کے کھڑکی میں سے باہر دیکھنے لگی۔ کھڑکی کا پردہ درمیان سے کالی کھلا

ہوا تھا اور اس میں سے بارغ کے درخت اور تھوڑا سا نیلا آسمان نظر آ رہا تھا۔

میں نے چائے کی پیالی خالدہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”تمہارے دل میں جو کچھ ہے وہ مجھے بتا دو۔ اشفاق کو میں بڑی

اچھی طرح سے جانتا ہوں۔ اگر تم کوگی تو میں اس سے کوئی بات

نہیں کروں گا۔“

اب جو خالدہ نے میری طرف گردن گھما کر دیکھا تو اس کی آنکھوں میں

آنسو چھٹک رہے تھے۔ میں وہیں گم سم سا ہو کر رہ گیا۔ معاملے کی نوعیت کو

میں بہت کچھ سمجھ چکا تھا مگر معاملہ اتنا آگے بڑھ چکا ہو گا اس کا مجھے گمان تک

نہیں تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کہوں۔ کیا کہوں۔ بس یہی کہا۔

”ارے! تمہاری آنکھوں میں ’نسو کیوں’ گئے؟“

خالدہ مسکرا دی۔ یہ بڑی اداس بڑی غم زدہ مسکراہٹ تھی۔ کہنے لگی۔

”اشفاق صاحب مجھ سے فون پر بات کیوں نہیں کرتے؟ میں جب

بھی فون کرتی ہوں وہ یہ کہہ کر فون بند کر دیتے ہیں کہ بی بی بڑے

ضروری کام سے جا رہا ہوں۔ پھر فون کر لیتا۔“

میں نے یونہی کہہ دیا۔

”تم فون کیوں کرتی ہو؟ ریڈیو سٹیشن آکر زبانی بات کر لیا کرو۔“

وہ گہرا سانس بھر کر بولی۔

”آپ کو معلوم نہیں۔ انہوں نے مجھے ریڈیو سٹیشن آنے سے منع

کر دیا ہے۔“

وہ کس لئے میں نے پوچھا۔

خالدہ نے کہا۔

”بس۔ یہ ان کو معلوم ہو گا۔“

میں نے کہا۔

”چھٹا تو جو تمہیں معلوم ہے وہ مجھے بتاؤ۔ کیا تم اشفاق سے پیار

کرتے تھی ہو؟“

خالدہ کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس نے سر جھکا لیا اور کسی گہری سوچ میں گم

ہو گئی۔ میں نے جب ہنسنے ہوئے اپنا سوال دہرایا تو اس نے لمبی میں سر ہلاتے

ہوئے وہیمی آواز میں کہا۔

”نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“

میں نے کہا۔

”یہ اچھی بات ہے۔“

خالدہ نے از خود موضوع بدل دیا اور دوسری باتیں کرنے لگی۔ میرا برتن

اٹھائے آیا تو میں نے اسے مل لانے کو کہا۔ صاف لگ رہا تھا کہ خالدہ مجھ سے

اشفاق کے بارے میں کچھ باتیں کرنا چاہتی ہے۔ اپنے دل کا حال کھول کر

میرے آگے بیان کرنا چاہتی ہے۔ مگر شرم اور حیا دامن گیر تھی۔ میں نے بھی

اس کی حوصلہ افزائی نہ کی۔ ہم کیمین سے نکل آئے اور لارنس پارک کی اس

سڑک پر چلتے گئے جو لارنس روڈ کی طرف جاتی ہے۔ کیونکہ خالدہ نے واپس

کالچ جانا تھا۔ لارنس روڈ والے گیٹ پر میں خالدہ سے جدا ہو گیا۔

شام کو پاک ٹی ہاؤس میں اشفاق احمد سے ملاقات ہوئی تو میں نے اسے

سارا قصہ سنایا۔ وہ پہلے تو ہوا حیران ہوا۔ پھر گردن کو جھٹک کر بولا۔

”بڑی پاکی لڑکی ہے۔“

میں نے کہا۔

”وہ تم سے محبت کرنے لگی ہے۔ میں تمہیں یہی مشورہ دوں گا کہ

اس کا دل نہ توڑو۔ وہ مجھے بڑی حساس لڑکی لگتی ہے۔ ویسے بھی

محبت کرنے سے تمہارے اندر ایک اچھی تبدیلی آ جائے گی۔ پھر تم

بھی رومانٹک افسانے لکھنے لگو گے۔“

وہ ہنس رہا تھا۔

”نہیں یاد! میں اس بک بک میں نہیں پڑنا چاہتا۔ خواہ مخواہ بدنامی

ہوگی۔“

میں نے کہا۔

”تم تو بالکل لڑکیوں ایسی باتیں کرتے ہو۔ تمہاری بدنامی کیسے ہوگی؟“

”

اشفاق نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

”چھوڑو یار۔ کوئی اور بات کرو۔ یہ تناؤ این انشاء سراچی سے کب آ

رہا ہے۔“

جس بات کا مجھے ڈر یا خیال تھا وہی بات ہوئی۔ اشفاق عشقِ محبت کے جھنجھٹ میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ یہ بات اس کی طبیعت کے خلاف تھی۔ میں نے بھی اس موضوع پر دوبارہ اس سے بات نہ کی۔ کبھی کبھی اسے چھپڑتا ضرور تھا۔ وہ فیس دیتا تھا۔ خالدہ سے بھی پھر ملاقات نہ ہوئی۔ ایک دن میں نے اشفاق سے پوچھا۔

”خالدہ کا فون تو نہیں آتا؟“

کہنے لگا۔

”ریڈیو سٹیشن پر آیا کرتا تھا۔ میں نے اسے منع کر دیا۔ اب فون نہیں آتا۔“

میں نے بڑے افسوس کے ساتھ کہا۔

”تم بڑے ظالم ہو اشفاق! ایک لڑکی تم سے اتنا پیار کرتی ہے اور تم اس سے بات تک نہیں کرتے“

وہ بولا۔

”بھابی! جس پنڈ جانا ہی نہیں پھر اس پنڈ کا راہ کیوں پوچھوں؟ یہ کام تم کرو۔ ہاں“

وہ سینے گزر گئے۔ اس دوران نہ تو خالدہ نے مجھے پاک ٹی ہاؤس فون کر

اور نہ ریڈیو سٹیشن آئی۔ وقت گزرتا چلا گیا۔ میرے ذہن سے بھی وہ تقریباً اڑ گئی۔ مجھے اپنی محبتوں سے فرصت نہیں تھی۔ میرا خیال ہے کہ وہاں ڈیڑہ سال گزر گئے ہوں گے کہ ایک روز مجھے پاک ٹی ہاؤس ایک لڑکی نے فون کیا اس نے اپنا نام نسreen بتایا۔ کہنے لگی۔

”آپ مجھے نہیں جانتے۔ میں خالدہ کی ممری سہیلی ہوں“

میں نے فوراً پوچھا۔

”اچھا اچھا۔ کیا حال ہے خالدہ کا؟“

دوسری طرف تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ میں نے ہیلو کیا تو دوسرے

طرف سے اجنبی لڑکی نے کہا۔

”میں فون پر آپ کو کچھ نہیں بتا سکتی۔ آپ پلیز مجھے کسی جگہ ملیں۔ مجھے آپ سے بڑی ضروری بات کرنی ہے۔“

میں کچھ پریشان سا ہو گیا۔ میں نے پوچھا۔

”خریت تو ہے نا؟“

”ہاں آپ مجھے کچھ ہی کسی وقت ملیں۔ یہ خالدہ کی زندگی اور موت

کا معاملہ ہے۔“

میں نے فوراً کہہ دیا۔

”میں اوپن ایئر کیپٹن لارنس باغ ابھی آتا ہوں۔ تم بھی آ جاؤ۔ یہ

کہنے دیکھا ہے نا تم نے؟“

”جی ہاں۔ میں آرہی ہوں“

دوسری طرف سے فون بند ہو گیا۔

○

یہی سوال کر سکتا تھا۔ نسرین کا چہرہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ دہلی چلی
سنانو لے رنگ کی لڑکی تھی۔ چہرے پر نہایت کی چمک تھی۔ کہنے لگی۔
”خالدہ نے مجھے آپ کے بارے میں بھی بہت کچھ بتا دیا ہوا ہے۔
اس لئے میں آپ کے پاس آئی ہوں۔ خالدہ نے اپنا برا حال کر لیا
ہے۔ گھر والے اس کی شادی طے کر چکے ہیں مگر وہ خود کشی کا فیصلہ
کر چکی ہے“

میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ مجھے ڈر لگا تھا کہ کہیں یہ لڑکی مجھے یہ نہ
بتائے کہ خالدہ نے خود کشی کر لی ہے۔ ایسی بات نہیں تھی خالدہ نے خود کشی کا
فیصلہ ہی کیا تھا۔ اور خود کشی کا فیصلہ کرنے والے خود کشی نہیں کیا کرتے۔ خود
کشی فیصلہ کرنے سے پہلے کی جاتی ہے۔ اور محبت کے معاملے میں جذباتی
لڑکیاں عام طور پر اس قسم کی باتیں بکيا ہی کرتی ہیں۔ میں نے نسرین سے
پوچھا۔

”یہ ایسا کیوں کرنا چاہتی ہے؟“

مجھے اس کی وجہ معلوم تھی مگر میں نسرین کی زبانی بھی سنا چاہتا تھا۔
کہنے لگی۔

”آپ کو تو سب حالات کا علم ہے۔ خالدہ اشفاق صاحب سے ہے۔

پناہ محبت کرتی ہے۔ یہ روحانی محبت ہے۔“

”روحانی محبت؟“ میں نے پوچھا۔

”جی ہاں! نسرین نے کہا۔“ خالدہ یہی کہتی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ میں

نے روحانی طور پر اشفاق صاحب سے شادی کر لی ہوئی ہے۔ اب

اگر گھر والوں نے میری کسی دوسری جگہ شادی کر دی تو میں دھڑک کر

مر جاؤں گی“

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”زہرا تھی آسمانی سے نہیں ملتا“

میں نے بھی دہسور رکھ دیا۔
قدرتی طور پر مجھے پریشانی کی لگ محسوس ہوتی تھی۔ میں اسی وقت فی
ہاؤس سے باہر نکلا۔ آگاہہ کرایا اور سیدھا لارنس بارغ جس کا نام آج کل بارغ
جنال ہے کے گیٹ پر پہنچ گیا۔ ان دنوں مال پر مانگے چلا کرتے تھے۔ دینے بھی
رش نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی تھی۔ نہ وہ تین نہ رکشا نہ سکورٹ۔ کبھی کبھار ہی
کوئی موٹر یا ٹرانسف قسم کی موٹر سائیکل گزرتی تھی۔

میں لارنس بارغ کی سڑک پر تیز تیز قدموں سے چلتا اوپن ایئر کیفے پہنچا۔
کیفے کی کرسیاں تقریباً خالی تھیں۔ میں نے کیبن کی کھڑکی پر نظر ڈالی۔ کیبن
بھی خالی تھا۔ نسرین ابھی تک نہیں آئی تھی۔ میں نے اس لڑکی کا نام بھی
فرضی لکھا ہے۔ نسرین کا اصلی نام کچھ اور تھا۔ میں لان کے کونے والی کرسی پر
بیٹھ گیا۔ میری نظریں لارنس روڈ والے گیٹ کی طرف لگی تھیں۔ نہ جانے
کیوں میرا خیال تھا کہ نسرین بھی اسی گیٹ کی طرف سے آئے گی۔ مگر وہ مال
روڈ والے گیٹ کی طرف سے آئی۔ ایک لڑکی کو میں نے دیکھا کہ اسواری
رنگ کا برقع پہنے ہاتھ میں کتابیں پکڑے چلی آ رہی ہے۔ اس نے نقاب الٹ
رکھا تھا۔ وہ پلاٹ میں سے ہو کر سیدھی میرے پاس آ گئی۔ اس نے میرا نام
لیا۔

”میں نے نقوش رسالے میں سب کی تصویر دیکھی تھی۔“

میں اسے لے کر کیبن میں آ گیا۔ میں نے پوچھا۔

”خیریت تو ہے؟“

نسرین بولی۔

”وہ کہتی ہے میں ڈی ڈی ٹی پی لوں گی“

میں نے کہا۔

”وہ پاگل ہے۔ اگر اسے اشفاق نے روحانی محبت ہے تو پھر خود کشی کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ روح تو لطیف ہوتی ہے وہ کسی دوسرے آدمی سے شادی کرنے کے باوجود بھی روحانی طور پر کسی سے اپنی محبت بٹا دہکتی ہے“

نسرین کہنے لگی۔

”خدا کے لئے آپ سمجھنے کی کوشش کریں۔ میں خالدہ کو جانتی ہوں۔ وہ بڑی حساس لڑکی ہے۔ وہ جو فیصلہ کرتی ہے۔ پھر اس پر عمل کر کے ہی رہتی ہے۔ وہ ضرور خود کشی کر لے گی“

میں نے کہا۔

”تو بی بی پھر میں کیا کروں؟ مجھے بتاؤ میں کیا کر سکتا ہوں؟“

نسرین نے کہا۔

”میں اس لئے آپ کے پاس آئی ہوں کہ آپ کو بتاؤں کہ آپ کیا کر سکتے ہیں“

”ہاں! مجھے بتاؤ میں کیا کر سکتا ہوں؟“

نسرین کہنے لگی۔

”کسی طرح اشفاق صاحب کو راضی کریں کہ وہ ایک بار خود خالدہ سے مل کر اسے سمجھائیں وہ نہ میری بات مانتی ہے نہ آپ کی بات مانے گی۔ صرف اشفاق صاحب ہی اسے خود کشی کے فیصلے سے روک سکتے ہیں۔ آپ یقین کریں خالدہ بڑی ضدی لڑکی ہے۔ وہ جان دے دے گی مگر شادی نہیں کرے گی“

میں نے کہا۔

”تم کسی طرح اس کے گھر والوں سے کہہ کر شادی رکوا نہیں سکتیں؟“

”یہ کام میرے بس میں نہیں ہے۔ اور پھر اس کی شادی کا فیصلہ گھر کے بڑے بزرگوں نے کیا ہے اور ہمارے خاندانوں میں شادی کا فیصلہ بزرگ ہی کرتے ہیں۔“

میں خاموش ہو گیا۔ نسرین بھی چپ سی ہو گئی۔ پھر اس نے بڑی رنج طلب نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور کہا۔

”میری سہیلی کی زندگی آپ لوگوں کے ہاتھ میں ہے۔ میں آپ سے التجا کرتی ہوں کہ پلیز آپ اشفاق صاحب سے کہیں کہ وہ خالدہ سے مل کر اسے سمجھائیں۔ وہ ان کی بات ضرور مان جائے گی“

میں نے کہا۔

”یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ مجھے بتاؤ خالدہ کہاں مل سکتی ہے۔“

میں وہاں اشفاق کو لے کر آ جاؤں گا۔“

مے یہ پایا کہ دوسرے روز دن کے دس بجے نسرین خالدہ کو لے کر پنجاب پبلک لائبریری کے گیٹ پر آئے گی۔ وہاں سے ہم لوگ کسی جگہ جا کر بیٹھ جائیں گے۔

”میں وہیں لائبریری میں ہی بیٹھوں گی۔ آپ چاہیں تو اشفاق صاحب کے ساتھ ہی گنگو میں شریک ہو جائیں۔ اگر چاہیں تو ان دونوں کو اکیلا باتیں کرنے دیں۔ آپ بھی میرے ساتھ لائبریری میں ہی رہیں۔ جیسے آپ مناسب سمجھیں“

میں نے کہا۔

”اس کا فیصلہ بعد میں ہو جائے گا تم کل پورے دس بجے دن پنجاب پبلک لائبریری پہنچ جاؤ۔ میں وہاں تمہارا انتظار کروں گی“

”اور اشفاق صاحب؟“ نسرین نے پوچھا۔

”وہ میرے ساتھ ہو گا۔ تم فکر نہ کرو۔“

نسرین کو رخصت کرنے کے بعد میں اشفاق احمد کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ مزنگ روڈ پر اس کے مکان پر گیا وہ وہاں نہیں تھا۔ لی ہاؤس میں بھی نہیں تھا۔ وہاں سے میں آرٹس ڈویژن کے سٹوڈیو بیڈن روڈ پر آگیا۔ ڈویژن صاحب نے بتایا کہ وہ تھوڑی دیر پہلے ”یا تھا کہہ رہا تھا کہ میں اپنے ایک عزیز سے ملنے جا رہا ہوں۔ وہاں سے میں ویڈیو سٹیشن چلا آیا۔ مجھے ایک تقریر کی ریکارڈنگ کروانی تھی۔ دوپہر کے بعد ریکارڈنگ سے فارغ ہو کر میں گھر چلا گیا۔“

شام کو پاک فی ہاؤس گیا۔ اشفاق وہاں نہیں تھا۔ میں اس کے گھر گیا۔ وہ مجھے مل گیا۔ میں نے جب اسے سارا قصہ سنایا تو وہ پریشان ہو گیا۔ کہنے لگا۔ ”میں کیا کر سکتا ہوں۔ ایسا کرو تم اسے جا کر سمجھا دو۔ وہ تو اسحق لڑکی ہے۔“

میں نے زور دے کر کہا۔

”تمہارا میرے ساتھ جانا بہت ضروری ہے۔ اور اس لڑکی نے کوئی ایسی ویسی حرکت کر لی تو اس کا سارا گناہ تمہارے سر پر ہو گا۔“

وہ میرا منہ بچنے لگا۔ پھر نشی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

”نہیں یار نہیں۔ میں اس بک بک میں نہیں پڑنا چاہتا۔ میری مانو۔ تم جا کر اس کو سمجھاؤ کہ بی بی اس قسم کی جذباتی باتیں نہیں کیا کرتے۔ ماں باپ جہاں کہتے ہیں وہاں شادی کر لو۔ یار مجھے تو اس لڑکی کے ساتھ کوئی محبت وغیرہ نہیں ہے۔ اس میں تیرا کیا قصور ہے؟“

میں نے کہا۔

”تم نے افسانے کیوں لکھے تھے؟ اب اگر تمہارے افسانے پڑھ کر کسی لڑکی کو تم سے محبت ہو گئی ہے تو تمہارا فرض بنتا ہے کہ اگر

اس کی محبت کا جواب محبت سے نہیں دے سکتے تو کم از کم اس کو برباد ہونے سے تو بچالو۔“

اشفاق احمد سوچ میں پڑ گیا۔ باؤل درخواست کہنے لگا۔

”ٹھیک ہے۔ میں مل لیتا ہوں اس سے کس کس وقت جانا ہو گا؟“

”نسرین اسے لے کر کل دس بجے پنجاب پبلک لائبریری کے گیٹ پر آئے گی۔“

”اور بیٹھیں گے کہاں؟ ایسی جگہ ہونی چاہیے جہاں ہمیں کوئی دیکھ نہ لے۔“

میں نے اسے بھڑکتے ہوئے کہا۔

”میں نہیں۔ اب زیادہ باتیں نہ بنائو۔ میں کر لوں گا کسی جگہ کا انتظام۔“

”یار کسی ہوٹل میں نہ رکھنا۔“

”فکر نہ کرو۔“

رات کو میں اپنے ایک دوست سے جا کر ملا جو وکالت کا امتحان دے رہا تھا اور اپنے فلیٹ میں اکٹھا رہتا تھا۔ میں اس دوست کا نام بھی نہیں لکھوں گا اور یہ بھی نہیں بتاؤں گا کہ اس کا فلیٹ لاہور میں کس جگہ واقع تھا۔ بہتر حال دوسرے دن میں اشفاق احمد کو لے کر پہلے اپنے دوست کے فلیٹ پر گیا۔ چابی میرے پاس تھی۔ فلیٹ کھول کر اشفاق کو وہاں بٹھایا اور کہا۔ ”تم ہمیں رہنا۔ میں خالدہ کو لے کر آتا ہوں۔“

اس وقت دن کے ساڑھے نو بجے تھے۔ وہاں سے میں سینڈھالا لائبریری آگیا۔ ابھی دس بجتے میں دس بارہ منٹ باقی تھے۔ میں لائبریری میں جا کر اخبار وغیرہ دیکھنے لگا۔ مگر مجھے بے چینی لگی ہوئی تھی۔ کسی خبر پر نظر نہیں جم رہی تھی۔ فوراً باہر نکل آیا اور گیٹ کی لائیک جانب درخت کی اوٹ میں کھڑا ہو گیا۔ بار بار گھڑی دیکھتا۔ دس بج گئے دس بج کر دس منٹ ہو گئے۔ نسرین

خالدہ کو لے کر نہ آئی۔ دل میں طرح طرح کے خیال آنے لگے۔ یہ دھڑکا بھی لگا تھا کہ کہیں میرے دوست کے فلیٹ سے اشتقاق ہی نہ بھاگ جائے۔ خدا خدا کر کے مجھے دو لڑکیاں نظر پڑیں۔ ایک نے برقعہ پہن رکھا تھا۔ دوسری بغیر برقعے کے تھی۔ برقعے والی نسرین تھی اور اس کے ساتھ والی لڑکی خالدہ تھی۔ قریب آئیں تو میں نے دیکھا کہ خالدہ کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ وہ پہلے سے کافی کمزور ہو گئی تھی۔ میں درخت کی اوٹ سے نکل کر سامنے آ گیا۔ میں نے انہیں اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ پرانی انارکلی والے بازار ہے ہمیں ٹانگہ مل گیا۔ ہم ٹانگے میں سوار ہو گئے۔ ٹانگہ مختلف بازاروں سے ہوتا ہوا منزل پر پہنچ گیا۔ راستے میں ہم نے کوئی بات نہ کی۔ صرف خالدہ سے سرسری الفاظ میں اس کا حال پوچھا جس کا جواب اس نے دھیمی آواز میں جی "ٹھیک ہوں" دیا۔

سارا راستہ دل میں دعاں میں مانگتا رہا کہ اشتقاق فلیٹ پر موجود ہو۔ کہیں وہ فرار نہ ہو گیا ہو۔ خالدہ کی حالت واقعی بڑی خراب تھی۔ اس نے اشتقاق کی روحانی محبت کو دل پر لگا لیا تھا۔ فلیٹ کا دروازہ بند تھا۔ میں نے آہستہ سے دھتک دی۔ اشتقاق نے دروازہ کھولا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ میں اسے ایک طرف لے گیا۔

"خدا کے لئے لڑکی کی پوری دلجوئی کرنا۔ تم بڑی اچھی اچھی باتیں کر لیتے ہو اس کو بڑی محبت سے سمجھانا۔ لڑکی نادان ہے۔ اس سے یہی ایک غلطی ہوتی ہے کہ غلط آدمی کو دل دے بیٹھی ہے۔ اب تمہارا فرض ہے کہ اس کو اس طریقے سے منتقل کرنا کہ وہ باقی زندگی آرام اور سکون سے گزار سکے۔ میں اور نسرین لاہوری میں جا کر بیٹھیں گے۔"

اشتقاق نے دبی زبان میں کہا کہ میں وہیں ٹھہروں۔ میں نے نفی میں گریں ہلائی اور نسرین کے قریب آکر بلند آواز میں کہا۔

"چلو بھی نسرین ہم ذرا لاہوری ٹیک ہو آئیں۔ مجھے کچھ کتابیں

لکھوائی ہیں اس کے ڈیڑا گاڑیں یو"

میں اور نسرین کمرے سے نکل آئے۔ مجھے پتہ تھا کہ اشتقاق دروازہ بند نہیں کرے گا۔ میں نے برآمدے میں آکر پلٹ کر دیکھا۔ دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ میں واپس گیا۔ اشتقاق سے کہا۔

"بھائی جان اندر سے کنڈی لگا لو"

اور دروازہ بند کر دیا۔

وہاں سے میں اور نسرین پیدل ہی لاہوری کی طرف چل پڑے۔ اس زمانے میں لاہور بڑا تھوڑی آبادی والا شہر تھا۔ سڑک پر آج کی طرح ٹریفک کا شور و گناہ نہیں ہوتا تھا۔ ہم سڑک کے کنارے کنارے ہلے اطمینان سے باتیں کرتے جا رہے تھے۔ نسرین بار بار پوچھتی۔

"اشتقاق صاحب اسے اچھی طرح سمجھائیں گے نا؟"

میں نے کہا۔

"سے سمجھانا ہی تو آتا ہے۔ تم فکر نہ کرو۔ وہ بڑی اچھی طرح سمجھائے گا۔"

جتنی دفعہ میں اشتقاق کو کہہ آیا تھا کہ ہم ایک گھنٹے بعد آئیں گے۔ یہ ایک گھنٹہ میں اور نسرین نے لاہوری کی بجائے عجیب گھر کے کونے والے پلاٹ میں گھاس پر بیٹھ کر گزارا۔ اس کے بعد ہم نے ٹانگہ لیا اور واپس فلیٹ کی طرف روانہ ہو گئے۔ فلیٹ کا دروازہ بند تھا۔ میں نے کلن لگا کر سنا۔ اشتقاق احمد کی باتیں کرنے کی آواز سنائی دی۔ میں نے آہستہ سے دھتک دی۔ اندر سے اشتقاق کی آواز آئی۔

"دروازہ کھلا ہے اندر آ جاؤ۔"

کیسا شریف آدمی ہے اشتقاق احمد — میرے کہنے پر اس نے دروازے کی کنڈی لگا لی تھی۔ مگر میرے جاتے ہی اس نے کنڈی کھول دی

تھی۔ بسا ایسے آدمی کو کوئی عورت گوارا کر سکتی ہے؟ خدا جانے اس لڑکی خالہ پر کون سا بھوت سوار ہو گیا تھا۔ میں اور نسرین کمرے میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ خالہ کا موڈ بدلا ہوا تھا۔ چہرے پر پہلے والی پرموگی اور ویرانی غائب تھی۔ اشتقاق ہنس کر کہنے لگا۔

”لو بھئی! سارا معاملہ ٹھیک ہو گیا ہے۔ یہ تو بڑی بھولی بھالی کڑی ہے۔ چل کر بیٹے اب مسکراؤ۔“

خالہ واقعی مسکرانے لگی۔ نسرین تو اس سے لپٹ گئی۔ وہ خالہ کی واقعی بڑی جگر دوست تھی۔ خالہ کی بدلی ہوئی کیفیت دیکھ کر اسے بہت خوشی ہوئی تھی۔ میں نے بھی سکھ کا سانس لیا کہ ایک انجان لڑکی انٹرویو عاشق کے ہاتھوں مرنے سے بچ گئی۔ نیت سے نکل کر میں نے خالہ اور نسرین کو ایک تانے پر بٹھایا۔ خالہ نے مسکراتے ہوئے مجھے اور اشتقاق کو سلام کیا۔ اس کے بعد ہم پیدل چل پڑے میں نے پہلا سوال اشتقاق سے یہ کیا کہ اس نے خالہ پر کون سا جادو پھونکا ہے۔ اشتقاق دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو بجاتے ہوئے بولا۔

”ہنس کا کا! اس علم سے ترے خبر ہو“

میں وہیں فٹ پاتھ پر رک گیا۔ اشتقاق کو گھور کر دیکھا تو اس نے فوراً کانوں کو پکڑ لیا اور بولا۔

”خدا گواہ ہے۔ اس بات کا تصور بھی نہ کرتا“

”وہ تو میں نہیں کرتا۔ مگر تمارے انداز سے لگتا ہے کہ۔۔۔“

”توبہ توبہ!“

اشتقاق بار بار کانوں کو ہاتھوں سے چھونے لگا۔ میں سمجھ گیا کہ اس نے ضرور اپنا کوئی خاص منتر پھونکا ہے۔ اشتقاق کے پاس بڑے منتر ہیں۔ ہر موقع نکل کے لئے اس کے پاس ایک سے زیادہ منتر موجود ہوتے ہیں۔ اس معاملے میں وہ پردھان منتری ہے۔ میں نے اسے منتر پھونکنے اور پھر اس منتر کا

کامیاب اثر ہوتے دیکھا ہے۔ خالہ کے معاملے میں اس نے اپنا کوئی ٹھنڈا ٹھنڈا روحانی منتر پھونکا تھا جو کارگر ثابت ہوا اور خالہ کا ذہن بدل گیا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ ایک سیدھی سادی شریف لڑکی غلط قسم کے ذہنی انتشار اور جذباتی بیجوان سے نجات پا گئی۔ اس کے بند خالہ کافی عرصے تک مجھے کہیں نظر نہ آئی۔ کوئی دو برس بعد نسرین سے اتفاقاً ”کسی کالج کے فکشن میں ملاقات ہو گئی۔ اس نے بتایا کہ خالہ نے اپنے ماں باپ کی مرضی سے شادی کر لی ہے اور اب وہ کراچی میں اپنے خاوند کے ساتھ خوش و خرم زندگی بسر کر رہی ہے۔ اس کی ایک پیاری پیاری بچی بھی ہے۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ میں نے یہ خوش خبری اشتقاق کو سنائی تو وہ بھی بڑا خوش ہوا۔ کہنے لگا۔

”چلو! یہ بھی اچھا ہوا۔ خدا اسے خوش رکھے“

اشتقاق احمد کی یہ عادت مجھے شروع ہی سے اچھی لگی تھی۔ اپنی جوانی کے زمانے میں بھی وہ بزرگوں کی طرح ہر کسی کی خیر مانگتا۔ ہر کسی کا بھلا چاہتا۔ لڑائی جھگڑے سے دور رہتا۔ میں نے کئی بار اسے کہا کہ چلو ہیرا منڈی چلتے ہیں۔ صرف سیر کر کے آجائیں گے۔ مگر وہ کبھی میرے ساتھ وہاں نہ گیا۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے وہ کسی دوسرے آدمی کے ساتھ بھی کبھی ہیرا منڈی نہیں گیا۔ میں بھی ہیرا منڈی مجرا بننے کے لئے نہیں جایا کرتا تھا۔ بس اپنے کسی دوست کے ساتھ سیر کرنے چلا جاتا۔ وہاں کی رونق اور کوشوں سے آتی جھنگڑوں کی آواز، گانے کی آوازیں مجھے اچھی لگتی تھیں۔ ریڈیو شیشن پر شاہی مجھے کی گانے والیوں کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ ان کے ساتھ اشتقاق بڑے اخلاق سے ملتا۔ اپنی باتوں سے انہیں خوب ہنساتا۔ ان سے شائستگی کی حد تک مذاق بھی کرتا۔ اس سے زیادہ اس کا کسی گانے والی کے ساتھ کوئی واسطہ نہیں رہا تھا۔

اشتقاق احمد ان دنوں اپنی بھرپور جوانی کے عالم میں تھا۔ وہ اگر چاہتا تو

ایک وقت دو دو رومان چلا سکتا تھا۔ مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ ایک تو وہ اندر سے کمزور اور شریف آدمی ہے۔ اور پھر لڑکیوں کے سامنے بڑی جلدی شرماتا تھا۔ البتہ میں نے دیکھا ہے کہ وہ اس زمانے میں بھی اپنے سے بڑی کافی بڑی عمر کی خواتین کے ساتھ بڑی جلدی گھل مل جاتا۔ ان کے پاس بیٹھ کر بڑا خوش ہوتا۔ اس کی کیا وجہ ہے۔ یہ مجھے نہیں معلوم۔ ہو سکتا ہے اشفاق کو بھی معلوم نہ ہو۔ ریڈیو مشین پر شاہی محلے کی ایک گانے والی آرٹسٹ آیا کرتی تھی۔ میں اس کا نام نہیں لکھوں گا۔ وہ اب زندہ نہیں ہے۔ بڑی خوش گفتار، خوش اخلاق اور دل کی بڑی اچھی عورت تھی۔ وہ اشفاق احمد کو اشفاق جی کہہ کر مخاطب کیا کرتی۔ شکل صورت کی بھی بڑی اچھی تھی۔ عمر میں وہ اشفاق احمد سے چند رہ میں برس بڑی تھی۔ اس کا نام میں لیلیٰ رکھ لیتا ہوں۔ لیلیٰ کا گھر شاہی محلے کی ایک چھوٹی سی گلی میں تھا۔ اسے کتابیں رسالے پڑھنے کا بھی بڑا شوق تھا۔ ایک دفعہ میں شام کے وقت شاہی محلے کی سیر کر رہا تھا کہ اتفاقاً ایک پان ہالے کی دکان کے سامنے لیلیٰ سے ملاقات ہو گئی۔ وہ مجھے شاہی محلے میں دیکھ کر بڑی خوش ہوئی۔ ظاہر ہے اسے خوش ہونا ہی تھا۔ کہنے لگی۔

”یہاں تک آگئے ہو تو اب میرا گھر بھی چل کر دیکھ لو“

میں اس کے ساتھ اس کے گھر آگیا۔ تنگ سی گلی میں مکان تھا۔ مگر اس نے ڈرائنگ روم بڑا سجا رکھا تھا۔ شیفت میں اردو کی کتابیں لگی تھیں۔ ان میں نقوش کے رسالے بھی تھے۔ کہنے لگی۔

”اشفاق جی کا افسانہ جس رسالے میں چھپتا ہے میں اسے خرید کر جلد کراچی ہوں اور سنبھال کر رکھ لیتی ہوں“

میں نے دس میں سوچا کہ یہ بھی ماری گئی۔ مگر فوراً مجھے خیال آگیا میں جس علاقے میں موجود ہوں اس علاقے کی عورتیں یونہی نہیں مرا کرتی ہیں لیلیٰ سے کہا۔

”اس کا مطلب ہے کہ تم اشفاق جی سے محبت کرنے لگی ہو“

لیلیٰ فس پڑی۔ کہنے لگی۔

”یہ کھیل تم لوگوں کے ہیں۔ ہم کوئی اور کھیل کھیلتی ہیں۔ اچھا بتاؤ۔ تمہارے لئے کیا منگواؤں؟ چائے یا شراب؟“

میں نے کہا۔

”پہلے چائے منگواؤ۔ پھر شراب“

وہ بڑی خوش خوش الماری کی طرف بڑھی۔

”شراب تو تھوڑی بہت یہاں ضرور پڑی ہوئی ہوگی“

اس نے الماری کھولی۔ اوپر نیچے ہاتھ مارے اور پھر ایک بوتل نکالی جس میں کچھ شراب باقی بچی ہوئی پڑی تھی۔ بوتل میز پر میرے سامنے رکھتے ہوئے بولی۔

”اس میں سے مجھے صرف دو پیگ دے دینا۔ باقی تم پی لینا۔ پانی

سے پیو گے یا سوڈا واٹر منگواؤں؟ میں تو کوا کولا ڈال کر پیتی ہوں۔

اس کا کڑوا کڑوا ذائقہ مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا“

یہ عورت جس کا فرضی نام میں نے لیلیٰ رکھا ہے ویسے بھی بڑی صاف گو اور صاف دل کی عورت تھی۔ کبھی منافقت نہیں کرتی تھی۔ جو دل میں ہوتا صاف کہہ دیتی۔ مگر ایک پیگ پینے کے بعد اس کا دل بہت زیادہ کشادہ ہو گیا۔ جو بات اس کے دل میں شاید کبھی نہ آئی ہو اس نے وہ بھی کہہ دی۔ میں نے جان بوجھ کر اشفاق کی باتیں شروع کر دیں۔ لیلیٰ کا اردو کا علم بھی داہنی سا تھا۔ وہ سگریٹ پی رہی تھی۔ جلدی سے اٹھ کر کتابوں کی شیفت کے پاس گئی اور وہاں سے نقوش کا کوئی نمبر نکال کر لے آئی۔ اس میں اشفاق احمد کا کوئی افسانہ چھپا ہوا تھا۔ وہ صفحہ نکالا اور اشفاق کا افسانہ اونچی ”واد میں پڑھنے لگی۔ وہ بڑے جوش میں آگئی تھی۔ ایک پیرا کرافٹ ہی پڑھ سکی۔ رسالہ بند کر کے میز پر رکھ دیا اور دوسرے پیگ کا گھونٹ بھر کر سر ہلاتے ہوئے بولی۔

”تم کو کیا معلوم۔ شاہ جی بڑے سپنے ہوئے بزرگ ہیں۔ اتنی سی عمر

میں ہی انہیں بہت کچھ مل گیا ہے۔
میں نے پوچھا۔ ”کون شاہ جی؟“
لیلیٰ نے ہاتھ کو جھپٹتے ہوئے کہا۔
”اپنے تلقین شاہ جی۔ اشفاق جی۔“

میں نے فوراً لیلیٰ کی طرف سے توجہ ہٹا کر اپنی توجہ بوتل پر مرکوز کر دی
جس میں بڑی تھوڑی شراب رہ گئی تھی۔ میں نے لیلیٰ کو صاف صاف کہہ دیا۔
”تم اپنے دو پیسک پی چکی ہو۔ اب باقی میری ہے۔“
لیلیٰ نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے کہنے لگی۔
”فکر کیوں کرتے ہو۔ یہاں جو چاہو گے جس وقت چاہو گے ملے گا۔“

پھر وہ صوفے پر میرے ہاتھ لگ کر بیٹھ گئی اور بڑی حسرت کے ساتھ
بولی۔

”تم شاہ جی کے“ میرا مطلب ہے اشفاق جی کے دوست ہو۔ کبھی
اسے میرے گھر لاؤ۔ تم تیس دانتوں میں سے جو کو گے میں پورا کر
دوں گی۔ بس تم مجھے اس کی مریدنی بنا دو۔ میں تمہیں چاندی کا کڑا
پسناؤں گی۔ ساری برادری کی دعوت کروں گی۔“

وہ نہ جانے کیا کیا کچھ بولتی رہی۔ مجھے اس کی صرف آواز ہی آ رہی
تھی۔ پھر آواز بھی اتنی تقریباً بند ہو گئی اور میں وہاں سے نکل آیا۔
میں نے اگلے روز اشفاق احمد کو مبارک پادوی اور تھاپا کہ لیلیٰ اس کی
مریدنی ہو گئی ہے۔

”کیا ایکو اس کر رہے ہو؟“ وہ بولا

جب میں نے اسے گزشتہ رات کا پورا قصہ سنایا تو مجھے ہدایتیں دینے
لگا۔ ”یہ بری عادتیں ہیں۔ انہیں چھوڑ دو۔ وہاں مت جایا کرو۔ میں ان لوگوں
کو برا نہیں کہتا۔ مگر تم وہاں جاؤ گے تو یہ تمہاری برائی ہوگی۔“

میں ہنکراتے ہوئے اشفاق کی ہدایتیں سنتا رہا۔ جب وہ خاموش ہو گیا
تو میں نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔

”وہیے لیلیٰ تم پر مرقی ہے۔ ایک بار میرے ساتھ صرف ایک بار
اس کے گھر چلے چلو۔ تمہیں لکھنے کو بہت کچھ ملے گا۔ میں تو رومان
پرست بندہ ہوں۔ میرا یہ موضوع نہیں ہے۔“

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اشفاق لیلیٰ سے کتراتے لگا۔ پہلے وہ اس کے پاس
بیٹھ کر باتیں کر لیا کرتا تھا۔ اب وہ بے حد محتاط ہو گیا۔ دور سے لیلیٰ سے سلام
دے لیتا اور اوپر ادھر ہو جاتا۔ لیلیٰ بھی عجیب عورت نکلی۔ دو روز بعد جب وہ
پردگرم کرنے ریڈیو سٹیشن آئی تو وہ اس رات کی اکثر باتیں بھول چکی تھی۔
جب میں نے اسے بتایا کہ اشفاق احمد اسے اپنی مریدنی بنانے پر راضی ہو گیا
ہے تو وہ حیران سی ہو کر بولی۔

”وہ کیوں؟“

میں مضحک سا گیا۔

”بھئی! تم نے خود ہی تو اس رات کہا تھا کہ مجھے شلو جی کی مریدنی بنا
دو۔ تمہیں چاندی کا کڑا پسناؤں گی۔
وہ اور زیادہ حیران ہوئی۔ کہنے لگی۔
”میں نے کب کہا تھا؟ کہاں کہا تھا؟“

میں برا خوش ہوا۔ اس عورت کو اسی قسم کے رد عمل کا اظہار کرنا
چاہیے تھا۔

مجھے اچھی طرح یاد نہیں کہ اشفاق احمد اردو کا پروفیسر ہو کر انکی شادی
سے پہلے کیا تھا یا بعد میں کیا تھا بہر حال وہ انکی چلا گیا۔ کچھ عرصہ وہاں کی
یونیورسٹی میں اردو پڑھاتا رہا۔ اپنی مدت پوری کرنے کے بعد وہ پاکستان واپس آ
گیا۔ وہاں اس کی ایک اطالوی دانشور پروفیسر یوسانی سے بڑی دوستی ہو گئی۔
گزشتہ برس اس پروفیسر کا اطالیہ میں انتقال ہو گیا۔ اشفاق نے اطالوی زبان

بھی سیکھ لی تھی۔ پاکستان آکر اس نے اٹلی کے بارے میں اپنا افسانہ "روست
الکبریٰ" لکھا جو بڑا خوبصورت افسانہ ہے۔

بانو قدسیہ سے شادی کے بعد اشفاق سمن آباد میں آکر رہنے لگا۔ پہلے
پہل دو شیعوں والی کوٹھی میں رہتا تھا جو میرے گھر کے ساتھ والی کوٹھی ہے
اور اب نئی بن گئی ہے۔ اس کے بعد وہ مسجد حضرت والی گراؤنڈ کے سامنے
چھوٹی سی کوٹھی میں آگیا۔ یہاں میں اس سے ملنے اکثر جاتا رہتا۔ یہیں پہلی بار
میری ملاقات بانو قدسیہ کے بھائی آرٹسٹ پرویز ہشہ سے ہوئی جو بڑا اچھا
آرٹسٹ اور اس سے بھی اچھا انسان تھا۔ ہنس کھنکھہ ہرمل عزیز اور دل نواز
— میں ان دنوں فلمینگ روڈ پر رہتا تھا۔ ایک روز اشفاق میرے گھر
آیا۔ اس نے بتایا کہ اس کا ارادہ ایک منفرد قسم کا رسالہ نکالنے کا ہے۔

"یہ اپنی قسم کا انوکھا اور دلچسپ رسالہ ہو گا میرے دماغ میں اس
کے لئے بڑے عجیب عجیب منصوبے ہیں۔ تم پرچہ دیکھو گے تو خوش
ہو جاؤ گے۔"

اس نے مال روڈ پر جہاں "آفاق" اخبار کا دفتر تھا ایک چھوٹی سی شاہ
نشین کرائے پر لے لی۔ رسالے کا نام اس نے "داستان گو" رکھا۔ آفاق والی
بلڈنگ کے کچھ حصے ابھی تک چلے ہوئے تھے۔ فسادات کے دنوں میں اس
عمارت کو آگ لگا دی گئی تھی۔ "داستان گو" کا دفتر دوسری منزل پر سیڑھیاں
چڑھ کر باتیں ہاتھ آتا تھا۔ چھوٹا سا لمبوڑا کمرہ تھا۔ پہلو میں ایک شور روم
تھا۔ پرویز نے بڑے آرٹسٹ انداز میں اس کی آرائش کی۔ اشفاق ایک
کاؤنٹر نما میز کے پیچھے بیٹھا ہوتا۔ ہم دوست اسباب فی ہاؤس سے نکل کر وہاں آ
جاتے۔ خوب باتیں ہوتیں۔ شعرو شاعری پر باتیں ہوتیں۔ ریڈیو آرٹسٹ محمد
حسین اوزر آفتاب احمد بھی وہاں اکثر آتے۔ میں ان دنوں "آفاق" اخبار کے
ساتھ منسلک ہو گیا تھا۔ چنانچہ "داستان گو" میں میری اشفاق سے روز ہی
ملاقات ہوتی۔ "داستان گو" رسالہ پاکست سائز کا تھا اور اس میں کچھوی پکی

ہوتی تھی۔ اس کی لکھائی چھپائی بڑی معیاری تھی۔ ترجمین و آرائش کی ذمہ
داری پرویز کے سپرد تھی جس نے رسالے کی خوبصورتی میں اضافہ کر دیا تھا۔
سرورق بڑے کمال کے ہوتے تھے اشفاق نے اس میں "عبرت کدہ" کے نام
سے آپسی واقعات کا ایک سلسلہ شروع کیا جو لوگوں میں بڑا مقبول ہوا۔ اس
میں بعض واقعات تو ایسے تھے کہ لوگوں کو اب تک یاد ہیں۔ ان میں کچھ فرضی
تھے بھی ہوتے اور سچے واقعات بھی۔ پاک فی ہاؤس سے اٹھ کر اکثر ادیب
شاعر یہاں آکر محفل لگاتے۔ چائے کے دور چلتے۔ یہ زمانہ بھی اشفاق کے
ساتھ میری دوستی کا روشن اور یادگار زمانہ تھا۔

سعادت حسن منٹو سامنے مال روڈ کے پار کشمی سینٹن میں رہائش پذیر
تھے۔ وہ بھی کبھی کبھی "داستان گو" کے دفتر میں آ جاتے۔ محفل کی رونق میں
اضافہ ہو جاتا۔ منٹو صاحب اشفاق احمد سے بڑا پیار کرتے۔ منٹو صاحب کا یہ وہ
زمانہ تھا جب وہ تقریباً روز ایک افسانہ لکھتے اور کسی اخبار یا رسالے کے دفتر
میں جا کر اس کے عوض بیس پچیس روپے وصول کرتے اور تانگے میں بیٹھ کر
سے خانے کی طرف روانہ ہو جاتے۔ دوسرے اخباروں کی طرح روزنامہ "آفاق"
بھی اپنا بخت وار ادبی ایڈیشن نکالتا تھا۔ اس کے لئے بھی منٹو صاحب
کبھی کوئی افسانہ لکھ کر لے آتے۔ واپسی پر وہ دوسری منزل میں "داستان گو"
کے دفتر میں کمر تھوڑی دیر ضرور بیٹھتے۔ کبھی میں اور اشفاق احمد "داستان گو"
کے دفتر سے اٹھ کر منٹو صاحب کے ہاں چلے جاتے۔ ایک روز ہم گئے تو منٹو
صاحب ڈرائینگ روم میں صوفے کے کونے میں پاؤں اوپر اٹھا کر بیٹھے ہوئے
تھے۔ سامنے والے صوفے پر ایک دہلی چلی کالے رنگ کی عورت بیٹھی تھی
جس نے ساڑھی پہنی ہوئی تھی۔ منٹو صاحب موڑ میں تھے اور اس عورت سے
کھل کر باتیں کر رہے تھے۔ وہ عورت شربا بھی رہی تھی اور منٹو صاحب کی
باتوں کا مڑا بھی لے رہی تھی۔ منٹو صاحب نے اشفاق کی طرف دیکھا اور
عورت سے کہا۔

”چلو اچھا ہوا اشفاق احمد بھی آگیا ہے۔ اس نے پوچھ لو۔“
ہم دوسرے صوفے پر بیٹھ گئے۔ اشفاق احمد نے مسکراتے ہوئے
پوچھا۔

”کوئی خاص بات ہے منٹو صاحب؟“
منٹو نے موٹے شیشوں والی عینک کے اوپر سے اشفاق کو اپنی بڑی بڑی
آنکھوں سے گھور کر دیکھا اور کہا۔

”خاص بات کیا ہوتی ہے خواجہ؟“
پھر منٹو صاحب نے عورت کی طرف اشارہ کر کے کہا۔
”میں نے اس سے شرط لگائی ہے کہ میں تمہارے بریڈیز کا سائیز
زبانی بتا سکوں۔ یہ باقی ہی نہیں۔ کیوں خواجہ تم بتاؤ۔ کیا میں
ٹھیک نہیں کہہ رہا؟“

اب اشفاق احمد کے شرمانے کی باری تھی۔ وہ بغلیں جھانکتے لگا۔ منٹو
صاحب نے کڑک دار آواز میں کہا۔
”ہا خواجہ؟“

اشفاق نے فوراً کہہ دیا۔

”شاید آپ ٹھیک کہتے ہیں“

”اوئے شاید کیا ہوتا ہے؟“

پھر منٹو صاحب نے دونوں ہاتھوں کو اس طرح اوپر کیا جیسے کسی شے کا
سائز بتا رہے ہوں۔ ہاتھوں کو عورت کی طرف کر کے صوفے سے اٹھے۔
عورت کے قریب گئے تو وہ عورت سمٹ کر گچھا چمھا ہو گئی۔ اس کے بعد منٹو
صاحب اپنے خاص انداز میں ہنسنے لگے۔ ان کی ہنسی کی آواز نہیں آیا کرتی
تھی۔

ایک روز میں اشفاق کے پاس اس کے ”داستان گو“ والے دفتر میں آیا
تو وہ سر جھکائے میز پر بیٹھا کام کر رہا تھا اس روز موسم سرد تھا اور رات کو ہلکی

بارش بھی ہوئی تھی مال روڈ پر پینل کے درخت رات کی بارش میں دھلے
ہوئے تھے۔ نہرو ہوا چل رہی تھی۔ مال روڈ خالی خالی سی تھی۔ ”داستان گو“
کے دفتر میں بھی سردی تھی۔ اشفاق نے چھوٹا سا بجلی کا بیڑا چلایا ہوا تھا مگر اس
کی گرائنڈ صرف میز تک ہی محدود تھی۔ اشفاق نے ایک نظر اٹھا کر مجھے دیکھا
اور بولا۔

”آ جاؤ۔ بیڑے کے پاس بیٹھ جاؤ۔“

وہ پھر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ میں بڑے رومانٹک موڈ میں تھا
اور لارنس باغ کے درختوں کے پاس جانا چاہتا تھا۔ میں نے کہا۔
”یار کام پھر کر لیتا۔ چلو لارنس باغ چلتے ہیں۔“
اشفاق نے قلم رکھ دی اور مجھے گھورنے لگا۔
”یار کہتے تم ٹھیک ہو۔ چلو لارنس باغ چلتے ہیں۔“

○

ہم ”داستان گو“ کے دفتر سے اتر کمال پر آ گئے اور فٹ پاتھ پر پھیل کے درختوں کے نیچے سے ہوتے ہوئے لارنس باغ کی طرف روانہ ہو گئے۔ رات کی بارش کی وجہ سے فٹ پاتھ گیلیا گیلیا تھا۔ اشفاق نے اپنی مخصوص اطالوی گرم جیکٹ پہن رکھی تھی۔ میرے ساتھ چلا وہ کوئی ہسپانوی اداکار لگ رہا تھا۔ فٹ پاتھ خالی خالی تھا۔ کبھی کبھی کوئی آدمی سامنے سے آکر ہمارے قریب سے ہوتا گزر جاتا۔ ماں پر بھی ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی۔ ہمارے اوپر درختوں کی وحلی دھلائی شبنیاں لٹک رہی تھیں۔ ہوا میں نمی اور ٹھٹھک تھی۔ ہم پتھوں کی جیبوں میں ہاتھ ویسے چلے جا رہے تھے۔ اور باتیں بھی کر رہے تھے۔ مجھے یاد نہیں کہ ہم کیا باتیں کر رہے تھے۔ ضرور موسم درختوں اور افسانوں کے بارے میں باتیں کر رہے ہوں گے۔ کچھ کچھ یاد آتا ہے۔ جب ہم چڑیا گھر والے دروازے سے لارنس باغ میں داخل ہوئے تو اشفاق نے بائیں جانب گورنمنٹ کالج کے یونیٹل گارڈن کے درختوں کی طرف دیکھا اور کہا۔

”یار ایساں کمال کے درخت لگے ہیں۔ ہر ملک کے درخت دیکھنے کو مل جاتے ہیں“

ابھی چڑیا گھر والوں نے یہ راستہ بند نہیں کیا تھا۔ ہم اس سمت بڑے درخت کے قریب سے گزرے جس کی گنجائش شاخوں میں چگاڑا لٹے لٹکے ہوتے ہیں۔

میں نے اشفاق سے کہا۔

”ہم اوپن ایئر کیفے میں چائے پیئیں گے“

وہ کہنے لگا۔

”اس سردی میں اوپن ایئر میں بیٹھ کر چائے پیو گے تو نمونیا ہو جائے گا تمہیں۔“

میں نے کہا۔

”ہم بلیوڈ روم کے برآمدے میں بیٹھ کر چائے پیئیں گے۔“

اس وقت تک اوپن ایئر کیفے والوں نے ایک جانب اونچے اونچے درختوں کے سائے میں لکڑی کا ایک لمبوتر کاٹج بنا لیا تھا جس کے اندر بلیوڈ ٹیبل لگے تھے۔ شام کو لوگ یہاں آکر بلیوڈ کھیلنا کرتے تھے۔ کاٹج کے آگے لکڑی کے فرش والا ایک چھوٹا سا برآمدہ تھا جس پر چھت پڑی تھی۔ میں اور انور جلال شمرنا بھی اس جگہ آکر بیٹھ کر رہے تھے۔

یہ جگہ لارنس باغ کی سب سے رومانٹک جگہ ہے اور مجھے شروع ہی سے بڑی پسند تھی۔ ہم پھاڑی کے دامن میں آکر چھوٹی سی کچی پگ ڈنڈی پر ہو گئے۔ یہ پگ ڈنڈی مجھے ہمیشہ لٹکا اور برہا کے جنگلوں کی یاد دلاتی ہے۔ پگ ڈنڈی کے دونوں جانب اونچے اونچے کھنے درخت ہیں۔ ان درختوں نے پگ ڈنڈی کو اپنے سائے میں لے رکھا ہے۔ یہاں دونوں جانب انار امود اور آڑو کے درخت ہیں۔ جہاں سے یہ پگ ڈنڈی شروع ہوتی ہے وہاں کسی زمانے میں ساتھ ساتھ آگے ہوئے ایلچی کے تین درخت ہوا کرتے تھے۔ اب معلوم نہیں وہ درخت یہاں ہیں یا نہیں۔ مجھے بھی باغ جناح گئے مدت ہو گئی ہے۔ ان درختوں کی مالی بڑی دیکھ بھال کیا کرتے تھے۔ جب پھل دینے کا موسم آتا تو ان درختوں کی شانیں ایلچی کے پتھوں سے جھکی ہوئی ہوتی تھیں اور ایک مالی قریب ہی بیٹھا ان کی نگرانی کر رہا ہوتا تھا۔ میں نے اشفاق کو وہ درخت دکھائے۔ دسمبر جنوری کا زمانہ تھا۔ درختوں پر پھل نہیں لگا ہوا تھا۔ اشفاق وہاں رک گیا۔ درختوں کی طرف دیکھ کر کہنے لگا۔

”تمہیں معلوم ہے ان درختوں کو کھاد کے طور پر بکرے کا خون بھی دیا کرتے ہیں۔ ہمارے قصبے کے باہر ایک باغ میں ایلچی کے درخت

ہوا کرتے تھے۔ ہم رات کو باغ میں چوری چھپے جا کر ایلچیاں توڑ کر

لاتے تھے۔“

ہم دسمبر جنوری کی سردی میں پگ ڈنڈی پر سے گزرتے ہوئے بائیں

جانب اوپن ایئر کیفے کے بلیڈ روم والے برآمدے میں آکر بیٹھ گئے۔ یہاں سے باغ کا منظر بڑا دلکش نظر آ رہا تھا۔ سارا منظر سینا سکوپ کی طرح لگ رہا تھا۔ برآمدے میں بید کی کرسیوں پر بیٹھے ہم باتیں کرنے لگے۔ اسنے میں بیہر آ گیا۔ ہم نے چائے کے لئے کہا میں نے اٹلی کی باتیں شروع کر دیں۔ اشتقاق اطالیہ کی یادوں میں گم ہو گیا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

”وہاں تمہیں بوسانی کے علاوہ بھی کسی ایسی شخصیت سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے جو تمہیں یاد رہ گئی ہو۔“

اشفاق خاموش تھا۔ جیسے وہ ماضی کے دھندلے ایوانوں میں کسی کو تلاش کر رہا ہو۔ پیرا چائے لگا کر چلا گیا۔ میں چائے بنانے لگا۔ چائے کا ایک گھونٹ پینے کے بعد اشتفاق نے گہرا سانس لیا اور کہنے لگا۔

”یاد رہا! ایک عورت مجھے ملی تھی۔ کاش! تم بھی اسے ملے ہوتے۔ وہ ہماری یونیورسٹی میں پروفیسر تھی۔ اس کا نام ماریا تھا۔ عام شکل صورت کی عورت تھی۔ عمر تیس بیس کے قریب ہو گی۔ اس نے شادی نہیں کی تھی۔ بڑی خاموش خاموش رہتی تھی۔ کسی سے زیادہ گفتگو نہیں کرتی تھی۔ اطالوی عورتیں اور مرد بڑے باتونی ہوتے ہیں۔ بے مکان باتیں کرتے چل جاتے ہیں۔ مگر ماریا ان کے بالکل برعکس تھی۔ بہت کم بولتی تھی۔ چہرے پر ہر وقت ایک اوداسی سی جھلکتی تھی۔ مجھے اس عورت کی متانت اور سنجیدگی بڑی اچھی لگی۔ کیفے میرا میں یا یونیورسٹی کی روش پر کبھی کبھی اس سے ملاقات ہوتی تو ہم ایک دوسرے کو ہلو ہیلو کر لیتے۔ پھر ایسا ہوا کہ ہم ایک دوسرے کے دوست بن گئے۔ ایک بار میں اس کے مکان پر بھی گیا۔ وہ اپنی ماما کے ساتھ رہتی تھی۔ دونوں عورتوں نے شہر کے ایک متوسط سے علاقے میں چھوٹا سافلیٹ لے رکھا تھا۔ ایک دن میں نے اس سے پوچھ ہی لیا کہ ماریا تم نے شادی کیوں نہیں کی؟ ماریا نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ مجھے الہم میں سے تصویریں دکھا رہی تھی۔ اس نے الہم بند کر کے ایک طرف رکھ دیا اور دھیمی آواز میں کہا۔ شادی کرنے کو

دل نہیں مانتا۔ وہ مجھ سے کافی بے تکلف ہو گئی ہوئی تھی ورنہ میں اس سے اس قسم کا ذاتی سوال کبھی نہ کرتا۔ میں نے کہا۔ تمہارا کوئی یوٹے فرینڈ بھی نہیں ہے۔ کیا بات ہے؟ ہمارے ہاں تو تمہاری عمر کی عورتوں کے بچوں کی بھی شادیاں ہو چکی ہوتی ہیں۔ ماریا نے اس روز مجھے کوئی قلبی بخش جواب نہ دیا۔ دو تین دن گزر گئے۔ ایک روز شام کے وقت ہم دونوں روم کے ایک قدیم اور بوٹے پر سکون و مستوران میں بیٹھے کافی پی رہے تھے کہ ماریا کہنے لگی۔ پروفیسر! تم نے مجھ سے پوچھا تھا کہ میں نے اب تک شادی کیوں نہیں کی۔ اب میں تمہیں بتاتی ہوں کہ میں نے شادی اس لئے نہیں کی کہ جس سے مجھے شادی کرنی تھی وہ تمہارے ملک میں واپس جا چکا ہے تم پنجاب میں رہتے ہو ناں؟ وہ بھی پنجابی تھا۔ اس کا پورا نام صاحب داد تھا۔ میں اسے صاحب کہا کرتی تھی۔ پھر ماریا نے مجھے لکڑی کی ایک صندوقچی میں سے ایک تصویر نکال کر دکھائی یہ بلیک اینڈ وائٹ تصویر ایک فوجی جوان کی تھی جس کے کاندھے پر صوبیدار میجر کی پٹی اور کراؤن لگا ہوا تھا۔ یہ انگریز کے زمانے کی پنجاب رجمنٹ کا صوبیدار میجر تھا۔ میں نے ماریا سے کہا۔ یہ تو فوجی جوان ہے۔ تمہیں کہاں ملا تھا؟ ماریا اپنی یادوں میں گم تھی۔ سانس لے کر بولی۔ صاحب داد سے میری پہلی ملاقات فوجی قیدی کیمپ میں ہوئی تھی۔ وہ جنگی قیدی بن کر کیمپ میں اپنی رجمنٹ کے ساتھ ہی آیا تھا یہ قیدی کیمپ ہمارے پہاڑی گاؤں کے قریب ہی تھا۔ میں روزانہ جھٹے پر کپڑے دھوئے اور پانی بھرے جلیا کرتی تھی۔ وہ چپ ہو گئی۔ پھر صاحب داد کی تصویر کو غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔ یہ تصویر صاحب داد نے مجھے خود دی تھی۔ افسوس! میں اس پر صاحب داد کے دستخط نہ لے سکی۔ اس نے کہا تھا میں نے یہ تصویر قاہرہ میں اتروائی تھی۔“

اشفاق احمد نے اطالوی لڑکی ماریا کی جو ناکام داستان محبت سنائی وہ میں آپ کو اپنی زبان میں سناتا ہوں۔ ہوائیوں کہ دوسری جنگ عظیم میں شمالی افریقہ کے محاذ پر انگریزوں کی انڈین فوج ہرمنوں کے گھیرے میں آ گئی۔

جرمنوں نے انہیں قیدی بنا کر اٹلی کے ایک بڑے وسیع و عریض جنگی کیمپ میں منتقل کر دیا۔ ان قیدیوں میں انگریزی فوج کی کسی پنجاب رجمنٹ کے جوان بھی تھے۔ ان میں صوبیدار بھجر صاحب داد بھی تھا۔ یہ جنگی قیدی کیمپ ماریا کے گاؤں کے قریب ہی تھا۔ ماریا جہاں جیسے پر کپڑے دھونے جایا کرتی تھی وہاں سے کیمپ کی خاردار تاروں والی دیوار قریب ہی سے گزرتی تھی۔ وہ کپڑے دھوتے ہوئے اکثر قیدی فوجیوں کو کیمپ کی گراؤنڈ میں مشقت کرتے 'نیشن کھوتے' باغ بوٹے لگاتے دیکھا کرتی۔ کسی قیدی کو خار دار باڑ کے قریب آنے کی اجازت نہیں تھی۔

ایک روز ایسا اتفاق ہوا کہ ماریا جیسے کے پتھر پر بیٹھی کپڑے دھو رہی تھی۔ کیمپ کے گراؤنڈ میں قیدی فوجی فٹ بال کھیل رہے تھے۔ جرمن سپاہی دور کھڑے ان کی نگرانی کر رہے تھے۔ اچانک کسی نے فٹ بال کو ٹک لگائی تو بال خاردار تاروں والی دیوار کے پاس آ کر رک گیا۔ ایک فوجی قیدی دوڑتا ہوا آیا۔ اس نے بال اٹھایا اور ماریا کی طرف دیکھا۔ ماریا کہتی ہے کہ میں نے بھی اس قیدی کو دیکھا۔ وہ ماریا کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور فٹ بال اٹھا کر دوڑتا ہوا واپس چلا گیا۔

اب ایسا ہوتا کہ کسی نہ کسی بہانے وہ فوجی قیدی کانٹوں والی دیوار کے پاس آتا۔ ماریا کو ایک نظر دیکھتا۔ مسکرا کر ہاتھ سے سلام کرتا اور تیزی سے واپس چلا جاتا۔ ماریا کو وہ فوجی جوان بڑا اچھا لگا۔ پہلے پہل تو ماریا بڑی محتاط رہی۔ پھر وہ بھی قیدی کی طرف دیکھ کر مسکرا دیتی۔ ایک دن اس نے ہاتھ اٹھا کر قیدی کے سلام کا جواب بھی دیا۔ بس یہاں سے دونوں میں محبت ہو گئی۔

ایک دن اس قیدی نے جان بوجھ کر فٹ بال کو اس جانب ٹک لگائی کہ وہ ماریا ذرا نیچے جیسے پر بیٹھی کپڑے دھو رہی تھی۔ قیدی فٹ بال کے پیچھے دوڑتا ہوا آیا۔ جب وہ بال اٹھائے لگا تو اس نے کانڈ کی ایک گولی ماریا کی طرف پھینکی جو اس سے تھوڑی دور پتھروں میں آ کر گری۔ قیدی مسکراتا ہوا واپس

بھاگ گیا۔ کیونکہ جرمن سپاہی کسی بھی قیدی کو خار دار تاروں کے پاس نہیں جانے دیتے تھے۔ ماریا نے جلدی سے گیلے ہاتھ پونچھے اور اٹھ کر کانڈ کی گولی اٹھائی۔ ماریا نے باقاعدہ کانڈ میں تعلیم حاصل کی ہوئی تھی اور انگریزی زبان پر اسے عبور حاصل تھا۔ جنگ کی وجہ سے وہ شرمچھوڑ کر اپنی ماں کے پاس گاؤں میں آگئی تھی جہاں اس کے باپ کی تھوڑی سی زمینداری تھی۔

ماریا نے کانڈ کھول کر دیکھا۔ انگریزی میں صرف اتنا لکھا تھا۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ ماریا کہتی ہے کہ میں شرملا گئی۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس نے کانڈ کو تھک کر کے اپنی قبض کے اندر چھپا لیا۔ اگلے دن قیدی صاحب داد دور دور سے ماریا کو دیکھتا رہا۔ کیونکہ وہ جرمن سپاہی خاردار تاروں کے پاس ٹھل رہے تھے۔ اور اس روز قیدی فٹ بال بھی نہیں کھیل رہے تھے۔ تیسرے دن ماریا نے بھی ایک کانڈ پر انگریزی میں "ٹی لویو" لکھ کر اس کی گولی بنائی اور قبض کے اندر چھپا کر جیسے پر بیٹھی کپڑے دھوتی رہی۔ وہ بار بار کیمپ کی گراؤنڈ کی طرف دیکھتی۔ صاحب داد اسے کیس نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے سارے کپڑے دھو لئے تھے اب وہ انہیں پھوڑ رہی تھی کہ اچانک اس نے صاحب داد کو دیکھا وہ فٹ بال کے ساتھ آگیا ہی کھیلنا ہوا گراؤنڈ میں ادھر ادھر اچھل کود رہا تھا۔ پھر اس نے فٹ بال کو ٹک لگائی اور اس کے پیچھے دوڑتا ہوا خاردار تاروں کے پاس آگیا۔ اس نے ماریا کو مسکرا کر اشارے سے سلام کیا۔ ماریا نے جلدی سے قبض کے اندر سے کانڈ کی گولی نکالی اور اس کی طرف اچھا لگی۔ صاحب داد نے ٹپک کر اسے اٹھا لیا اور فٹ بال کو پاؤں سے تھوکر اس ماریا کیمپ کی بارکوں کی طرف چلا گیا۔

اب ان دونوں کے درمیان نامہ و پیام کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ہفتے میں ایک بار موقع پا کر صاحب داد کانڈ پر انگریزی میں محبت کا پیغام لکھ کر اس کی گولی بنا کر ماریا کی طرف پھینک جاتا اور دوسرے یا تیسرے دن موقع پا کر کسی بہانے جرمن سپاہیوں کی نظر بچا کر خاردار تار کے پاس آتا اور ماریا کا قہقہہ اٹھا

کر لے جاتا۔ ان رتھوں میں ایک دوسرے کے ساتھ محبت کا اظہار کیا گیا ہوتا۔ ایک دن صاحب داد خط کی گولی پھینک کر گیا تو ماریا نے اسے قیض میں چھپا لیا۔ پھر پتھروں کے پیچھے جا کر کھولا تو صاحب داد نے اظہار محبت کے بعد اس سے پوچھا تھا کہ اس کا گھر کہاں ہے۔ مجھے اس کا نقشہ بنا کر بتاؤ۔ کیونکہ میں نے قیدی کیپ سے فرار ہونے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

پہلے تو ماریا خط پڑھ کر گھبرائی۔ پھر اس نے بھی فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنے محبوب کی ہر طرح سے مدد کرے گی۔ اگلے خط میں اس نے خط میں اپنے گھر کا پتہ بتانے کی بجائے ایک باڑے کا نقشہ بنا کر صاحب داد کو اس کا رستہ سمجھایا اور کہا کہ فرار ہونے کے بعد وہ باڑے میں آجائے۔ اس کے بعد وہ اس کی ہر طرح سے حفاظت کرے گی۔ مویشیوں کا یہ باڑا اب ویران ہو گیا ہوا تھا اور بالکل خالی پڑا تھا۔ یہ کیپ سے شمال کی جانب دریا پار ایک ٹوٹی ہوئی بارہ دری کے عقب میں واقع تھا۔

دو دن بعد صاحب داد نے خط پھینکا جس میں ماریا کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اس نے لکھا تھا کہ وہ بہت جلد اپنے فرار ہونے کی تاریخ اور وقت لکھے گا۔ اس بات کو دو ہفتے گزر گئے۔ اس دوران صاحب داد دور دور سے ماریا کو دیکھ لیتا۔ وہ تاروں کے قریب بالکل نہ آیا۔ دو ہفتوں کے وقفے کے بعد وہ فٹ بال سے کھیلتا نظر آیا۔ ماریا سمجھ گئی کہ آج صاحب داد ضرور خط پھینکے گا۔ اور ایسا ہی ہوا۔ ایک بار اس نے زور سے فٹ بال کو ٹک لگائی جو لڑھکتا ہوا تاروں کے پاس اس جگہ آگیا جہاں دو بری جانب چٹان کی اوٹ میں جتنے پر ماریا کپڑے دھو رہی تھی۔ صاحب داد دوڑتا ہوا بال کے پیچھے آیا۔ جلدی سے رتھ ماریا کی طرف پھینکا اور فٹ بال کو لڑھکتا ہوا دو سری طرف نکل گیا۔ ماریا نے جلدی سے رتھ کھول کر پڑھا۔

صاحب داد نے لکھا تھا۔

”میں نے آج رات کیپ سے فرار ہونے کا فیصلہ کیا ہے۔ تم نے

جو مجھ بتائی ہے میں وہاں پہنچ جاؤں گا۔ میں کل شمارا وہاں انتظار کیوں گا۔ ضرور آنا۔ پھر ہم دونوں یہاں سے کسی دوسرے شہر چلے جائیں گے اور وہاں جا کر شادی کر لیں گے۔“

ماریا نے خط پڑھا تو اس کے گل حیا کی لالی سے سرخ ہو گئے۔ وہ رات اس نے سوتے جاگتے بسر کی۔ بار بار خدا سے دعا مانگتی کہ صاحب داد زندہ سلامت کیپ سے نکل جائے۔ جرمن سپاہیوں کے بارے میں اسے معلوم تھا کہ وہ بڑے سنگ دل ہیں اور ذرا سی بات پر گولی مار دیتے ہیں اور جو قیدی فرار ہو رہا ہو اسے تو وہ بالکل زندہ نہیں چھوڑتے۔ رات گزر گئی۔

اس کے کان کیپ کے سائرن کی طرف لگے ہوئے تھے اگر کسی قیدی کے فرار ہونے کا پتہ چل جائے تو کیپ کے سائرن چیخ اٹھتے ہیں۔ مگر کوئی سائرن نہ بجلا۔ ماریا بھی سمجھی کہ صاحب داد نے فرار ہونے کا منصوبہ ملتوی کر دیا ہو گا۔ پھر بھی وہ منہ اندھیرے گھر سے نکل کر دریا کی طرف روانہ ہو گئی۔ دریا کا پاٹ وہاں بہت چھوٹا تھا۔ یہ پاٹ ہی علاقہ تھا۔ دریا میں جگہ جگہ بڑی بڑی چٹانیں اور پتھر پڑے تھے۔ ماریا نے ان پتھروں پر پاؤں رکھ کر دریا پار کیا۔ دریا کی دو سری جانب کچھ فاصلے پر ایک ٹوٹی ہوئی پرانی بارہ دری تھی۔ وہ تیز تیز قدموں سے چلتی وہاں آئی اور پھر نشیب میں اتر گئی۔ اونچے نیچے ٹیلے سحر کی تاریکی میں چاروں طرف پھیلے ہوئے تھے۔ ماریا اس جگہ سے واقف تھی۔ بہت جلد اس نے دور سے مویشیوں کے ویران باڑے کی ڈھلوان چھت دیکھ لی۔

دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ باڑے کے قریب آکر وہ رک گئی۔ باڑے کا بڑا دروازہ بند تھا۔ وہ بچھلی طرف آگئی جہاں ایک کھڑکی بنی ہوئی تھی۔ یہ کھڑکی بھی بند تھی۔ وہ کھڑکی کے پاس جا کر اسے اندر کو دھکیل رہی تھی کہ کسی نے پیچھے سے آکر اسے اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ یہ صاحب داد تھا۔ ماریا کی جان میں جان آئی۔ دونوں محبت کرنے والے ایک دوسرے سے پہلی

بار مل رہے تھے۔ صاحب داد نے کہا۔

”ابھی تک میرے قرار کا جرموں کو علم نہیں ہوا۔ لیکن دن نکلنے کے بعد جب گراؤنڈ میں کتنی ہوگی تو پتہ چل جائے گا پھر جرم من کتے لے کر میری تلاش میں نکلیں گے“

ماریا پریشان ہو گئی۔ مگر جلدی اسے ایک خیال آگیا۔ اس نے صاحب داد سے کہا۔

”تم فکر نہ کرو۔ ہم ابھی یہاں سے نکل جاتے ہیں یہاں سے تھوڑے فاصلے پر آرنو کا قصبہ ہے۔ وہاں سے گھنٹے گھنٹے بعد ہمیں میکانو شمر کو جاتی ہیں۔ وہاں میری ایک سہیلی رہتی ہے۔ ہم اس کے پاس چلے جائیں گے وہ ہمیں کسی نہ کسی طرح سوئٹزر لینڈ پہنچا دے گی۔“

صاحب داد نے کہا۔

”میرے کپڑے قیدیوں کے ہیں۔ جلدی سے گھر جاؤ اور میرے لئے دوسرے کپڑے لے آؤ“

ماریا اگلے قدموں گھر کی طرف بھاگی اور اپنے باپ کی ایک پرانی پتلون اور لمبا گرم اور روکٹ لے کر آگئی۔ گھر میں کچھ خبر نہیں تھی۔ اس کے باپ ابھی تک سو رہے تھے۔ صاحب داد نے باڑے میں ہی جلدی جلدی پتلون پہنی۔ قبض کو الٹا کر کے اوپر مقلعہ لپٹا۔ اور روکٹ پرنا اور ماریا کے ساتھ آرنو قصبے کی طرف چل پڑا۔ آرنو قصبے میں پہنچتے پہنچتے سورج نکل آیا۔ صاحب داد کہنے لگا۔

”یہاں کوئی بس دیکھائی نہیں دے رہی گنتی شروع ہونے میں آدھا

گھنٹہ رہ گیا ہے“

ماریا نے کہا۔

”ابھی بس آجائے گی۔ تم فکر نہ کرو“

آرنو قصبے کے پرانے اور بوسیدہ مکانوں پر اداسی چھائی ہوئی تھی۔ گلیاں سبناں تھیں۔ لوگ گھروں میں ابھی بیدار نہیں ہوئے تھے۔ بس سٹیڈ بھی خالی تھا۔ ایک کسان بوڑھی عورت بیچ پر خاموش سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اسنے میں دور سے سڑک پر بس آتی نظر آئی۔ ماریا نے اٹالوی کے صاحب داد کو دیئے اور کہا۔

”انہیں اپنے پاس رکھو۔ نکل میں لوں گی۔ تم خاموش بیٹھے رہنا۔ کسی سے کوئی بات نہ کرنا۔ نہ کسی کی بات کا جواب دینا۔ باقی میں سنبھال لوں گی“

بس آکر رکی تو دونوں بس میں بیٹھ گئے۔ وہاں سے میکانو پہنچے۔ اس وقت دن کے دس بج چکے تھے۔ کمپ میں قیدی کے قرار کا پتہ چل گیا تھا اور جرمن سپاہی اس پاس کے علاقے میں صاحب داد کی تلاش میں نکل چکے تھے۔ میکانو میں ماریا صاحب داد کے ساتھ اپنی سہیلی کے گھر ایک ہفتہ رہی۔ یہ کوئی بارونق شہر تھا اور قیدی کمپ سے بہت دور تھا۔ ماریا کی سہیلی نے اپنے ایک قاتل اعتماد دوست کے ساتھ مل کر دونوں کو سوئٹزر لینڈ بھجوانے کی کوششیں شروع کر دیں۔ مگر کارروائی بڑی سست رفتار تھی۔ جنگ کا زور بھی بڑھ گیا تھا۔ لوگوں کو اپنی اپنی پڑی تھی۔ ایک روز اتحادی طیارے میکانو کے فوجی گیرزن پر بھی بم پھینک گئے۔

صاحب داد زیادہ تر گھر میں ہی چھپا رہتا۔ فوجی گیرزن پر بمباری کے بعد جرمنوں کی دو ہالین وہاں پہنچ گئیں شہر میں جرمن سپاہی چلتے پھرتے نظر آنے لگے۔ اٹالوی سپاہی بھی ان کے ساتھ ہوتے تھے۔ ماریا نے صاحب داد کو گھر سے باہر نکلنے سے سختی سے منع کر دیا۔ پہلے وہ ہفتے میں دو ایک بار بازار کا چکر لگایا کرتا تھا۔ اب وہ سارا سارا دن ماریا کی سہیلی کے گھر کی اوپر والی چھوٹی سی بیٹھک میں ہی پڑا رہتا۔ اس بیٹھک میں گھر کا پرانا ٹونا پھونٹا سامان پڑا تھا۔ ایک دن ماریا کچھ چیزیں خریدنے مارکیٹ گئی ہوئی تھی۔ گھر پر اس کی

سہیلی تھی۔ بیشک میں صاحب داد بھی موجود تھا۔ اچانک ایک فوجی ٹرک مکان کے سامنے آکر رکا۔ اس کے اندر سے دس بارہ جرمن سپاہی چلتا گئیں لگا کر باہر کودے اور ماریا کی سہیلی کے مکان کا بند دروازہ توڑ کر اندر گھس گئے۔ اندر جاتے ہی تین فوجی رائفلیں تانے اوپر والی بیشک کا زمینہ پھلانگتے بیشک کا بند دروازہ توڑ کر اندر آ گئے۔

سامنے صاحب داد حیران پریشان کھڑا تھا۔ صاحب داد کو اس وقت انہوں نے قابو میں کر لیا۔ اسے کھینچے ہوئے نیچے لے آئے اور ماریا کی سہیلی کو بھی پکڑ کر باہر لائے۔ دونوں کو ٹرک میں ڈالا اور ٹرک فوجی گیریزن کی طرف روانہ ہو گیا۔

یہ ساری کارروائی بیشک پانچ منٹ کے اندر اندر ختم ہو گئی۔ محلے کے لوگ باہر آکر سارا تماشا دیکھتے رہے۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ یہاں دشمن کا کوئی جاسوس یا بھاگ ہوا زیدی چھپا ہوا تھا۔ ماریا واپس آئی تو اس نے روز سے گھر کے باہر لوگوں کا ہجوم دیکھا تو سمجھ گئی کوئی خطرناک بات ہو گئی وہ دوسری طرف سے ہو کر لوگوں کے درمیان آ گئی۔ اس نے ایک نادان عورت سے پوچھا کہ یہاں کیا معاملہ ہے۔ اس نے جرمن سپاہیوں کو برا بھلا کہتے ہوئے بتایا کہ کوئی مفروضہ قیدی تھا، جرمن سپاہی اسے اور مکان میں جو عورت رہتی تھی دونوں کو پکڑ کر لے گئے ہیں۔

ماریا کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ ایک لمحے کے لئے اسے کچھ پتہ نہ چلا کہ وہ کہاں ہے اور یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ مگر فوراً ہی سنبھل گئی۔ وہیں سے لے پاؤں مارکیت کی طرف چل پڑی۔ اس کا ذہن تیزی سے سبج رہا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ بہت جلد وہ اس نتیجے پر پہنچ گئی کہ وہ کچھ نہیں کر سکتی۔ یہاں اس کا کوئی جینے والا بھی نہیں۔ ایک صاحب داد اور اس کی سہیلی تھی۔ دونوں کو جرمن فوج گرفتار کر کے لے گئی تھی۔ اب ان کا برا حال ہونے والا تھا۔ ماریا کا ناؤک جسم خوف کے مارے کانپنے لگا۔ اس کی آنکھوں

میں آنسو آ گئے۔ وہ مارکیت میں جانے کی بجائے شہر سے باہر آ گئی۔ وہ ایک پرانے بارغ میں آکر بیٹھ گئی۔ یہاں بیٹھ کر بہت روئی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اس کے خوابوں کے محل ویران ہو گئے تھے۔ اسے بار بار صاحب داد کا خیال آتا۔ جرمن اس کو پکڑ کر واپس کیمپ میں لے گئے ہوں گے۔ اسے اپنی سہیلی کا بھی خیال آ رہا تھا۔ خدا جانے جرمن اس کا کیا حال کریں گے۔

اس دن ماریا واپس اپنے گاؤں کی طرف روانہ ہو گئی۔ شام کو وہ اپنے گھر میں تھی۔ اس نے ساری کہانی اپنے بوڑھے ماں باپ کو بیان کر دی۔ باپ نے ماریا کو بہت ڈانٹا کہ تم ہم سب کو یہاں سے نکلواؤ گی۔ جرمنوں کو پتہ چل گیا کہ تم نے قیدی کی مدد کی تھی تو وہ ہمیں بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ ماریا کا باپ اس قدر خوف زدہ ہوا کہ راتوں رات وہ قصبے والے مکان سے بیوی اور ماریا کو بے کر نکل پڑا اور میلان اپنے چھوٹے بھائی کی زمینداری میں چلا گیا۔

اشفاق احمد کہنے لگا۔

"ماریا نے بتایا کہ اس کے بعد صاحب داد سے اس کی پھر بھی ملاقات نہ ہو سکی۔ اس کے دل میں صاحب داد کی محبت کا نقش اتنا گہرا تھا کہ وہ اسے کبھی نہ بھلا سکی۔"

ہماری باتوں میں آسمان پر بادیں چھا گئے تھے اور ہلکی ہلکی بومدیا باندی شروع ہو گئی تھی۔ میں نے پیرے کو مزید چائے لانے کے لئے کہا۔ اشفاق کہنے لگا۔

"نہیں یار۔ بڑی دیر ہو گئی ہے۔ چلتا چاہیے مجھے ابھی پڑا کام کرنا ہے۔"

میں نے کہا۔

"ماریا کی کہانی سنانے کے بعد بھی تم کو دنیا داری کا خیال آ رہا ہے۔ تم نے اتنی رومانیک اور اواس کہانی سنائی ہے کہ میں روم کے شہر

میں ماریا کے پاس پہنچ گیا ہوں۔
اشفاق ہاتھوں کو رگڑ رگڑ کرتے ہوئے بولا۔

”یار ماریا مجھے بھی بڑی یاد آتی ہے بڑی سنجیدہ مزاج خاتون تھی۔
یورپ کے ماحول میں محبت کی اس قسم کی روایات اب کہاں ملتی
ہیں بھلا؟ ماریا بالکل ہمارے ماحول کی خاتون تھی۔ ویسے بھی اٹلی
دالوں پر مشرقی روایات کا کافی اثر ہے۔“

میں بارش کی طرف دیکھ رہا تھا جس کے موتی درختوں کی شاخوں پر سے
پھسل کر گھاس پر گر رہے تھے۔ سردی زیادہ ہو گئی تھی۔ چائے کا دو سرا دوڑ
چلے لگا۔ چائے ختم ہوئی تو بارش بھی رک گئی۔ اشفاق کندھوں کو جھٹکتا ہوا
اٹھ کھڑا ہوا۔

”بس یار۔ اب میں نہیں بیٹھ سکتا۔ اب یہاں سے نکل چلو۔ پیچھے
نہ جان کون کون ملے آیا ہو گا۔“

لارنس باغ والے کچے راستے سے ہماری واپسی بڑی رومانٹک تھی۔
میں تو جیسے سری لنکا کے کسی جنگل میں سے گزر رہا تھا۔ مگر بڑی جلدی میرا
جنگل کا خواب ٹوٹ گیا اور میں چڑیا گھر کے سامنے مال روڈ پر آ گیا تھا جہاں
ایک ٹانگہ ٹھکا ٹھک جا رہا تھا۔

مئی کا مہینہ شروع ہو گیا تھا۔ لاہور میں کافی گرمی پڑنے لگی تھی۔ لو
بھی چلنا شروع ہو گئی تھی۔ میں اشفاق احمد کے پاس ”داستان گو“ والے دفتر
میں بیٹھا تھا کہ ہمارا ایک خوش باش قسم کا دوست آگیا۔ اس کا نام سکندر تھا۔
آج کل وہ شارچہ میں ایک عرصہ سے مقیم ہے اور وہیں کاروبار کرتا ہے۔
سکندر ادب نواز آدمی تھا اور ہر وقت سیر پانے کے موڈ میں ہوتا۔ کبھی آتا تو
آتے ہی مکتا چلو یا ریشیاز چلتے ہیں۔ چلو لارنس کی سیر کر آئیں۔ اس روز وہ
”داستان گو“ کے دفتر میں آیا تو آتے ہی اف اف کرتے لگا۔

”لاہور میں بڑی گرمی پڑ رہی ہے۔ اشفاق صاحب چلیں آپ کو

ایک خوبصورت مہر کی سیر کرو لاؤں۔ خدا کی قسم! پاکستان میں اتنی
خوبصورت نہریں ہیں کہ کیا بتاؤں۔“
اشفاق نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”بھائی اکام بہت کرنا ہے۔ پرچہ پریس میں جانے والا ہے۔“
سکندر نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

”اشفاق صاحب پرچہ پریس میں جاتے ہی رہتے ہیں۔ اس وقت
موقع ہے۔ لو بھی چل رہی ہے۔ گرمی بھی پڑ رہی ہے۔ نیچے گاڑی
بھی کھڑی ہے۔ شیخوپورہ والی سڑک ہی جانا ہے۔ ایک گھنٹے میں
واپس آ جائیں گے۔“

میں تو تیار ہی تھا خدا جانے اشفاق احمد کیسے تیار ہو گیا کرسی سے اٹھتے
ہوئے بولا۔

”چلو بھائی سکندر اذرا نہریں بھی نہا آئیں۔ اپنے قہیے کی نہریں
نہاے ایک عرصہ گزر گیا ہے۔“

ہم نیچے آکر گاڑی میں بیٹھے۔ سکندر گاڑی نکال کر مال پر لے آیا اور
پھر اس کا رخ شیخوپورہ کی طرف کر دیا۔ شاید وہ پہنچے تو شیخوپورہ والی سڑک
پر ہو گئے۔ شیخوپورہ والی سڑک اس زمانے میں بڑی پرسکون سڑک ہوا کرتی
تھی۔ چھوٹی سی سڑک تھی۔ دونوں طرف ٹاہلیوں کے درخت کھڑے تھے۔
بڑی ہری بھری سرسبز خوشبودار ٹاہلیاں ہوا کرتی تھیں۔ مئی کے دنوں میں ان پر
بور آ جاتا تھا۔ ساری سڑک ان کی خوشبو سے مہک رہی تھی۔
سڑک پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا۔ ابھی یہاں کارخانے نہیں لگے
تھے۔ فضا صاف تھی۔ سکندر کافی تیز گاڑی چلا رہا تھا۔ دیکھتے دیکھتے ہم نہریں پہنچ
گئے۔ سکندر نے گاڑی ایک طرف کھڑی کی۔ ہم نہر کے کنارے پر چڑھ گئے۔
کنارے سڑک سے اونچے تھے۔ نہر کو دیکھا تو ایک عجیب منظر آنکھوں کے
سامنے تھا۔ لہالب بھری ہوئی نہریں پرسکون کے ساتھ بہ رہی تھی۔ دھوپ

میں ان کی سطح شیشے کی طرح چمک رہی تھی۔ پانی کی سطح پر پتے لہروں کے ساتھ تیرتے چلے جا رہے تھے۔ صرف ان پتوں کی وجہ سے محسوس ہو رہا تھا کہ سرسبز رہی ہے۔ اشفاق احمد نے سفید شلوار قمیض پہن رکھی تھی۔ مجھے یاد ہے اس نے سر کے کنارے پر آتے ہی سر میں دھڑام سے چھلانگ لگا دی اور دوسرے کنارے کی طرف تیرنے لگا۔ اس کی شلوار منگھ کی طرح پھول مٹی۔ مجھے بڑی ہنسی آئی۔ میں نے چلتون قمیض پہنی ہوئی تھی۔ دل تو میرا بھی چاہتا تھا کہ سر میں نماؤں۔ کبھی امرتسر کے کہنیں پارغ والی سر میں صبح شام چھلانگیں لگایا کرتا تھا۔ مگر چلتون قمیض کی وجہ سے مجبور تھا۔ مجھے اشفاق پر بڑا رشتہ آیا اور وہ مجھے اس وقت برا اچھا لگا کہ اس نے کچھ سوچے سمجھے بغیر کپڑوں سمیت سر میں چھلانگ لگا دی تھی۔

کاش! میں بھی ایسا کر سکتا۔ اشفاق احمد تیرتا تیرتا سر کے دوسرے کنارے تک گیا۔ وہاں سے اس نے مجھے آواز دی۔

”حیدر! ماروے چال۔ آجاتوں دی“

میں ہنستا رہا۔ سکندر بھی مسکراتا رہا اور خوش ہوتا رہا۔ ہم دونوں میں سے کسی نے بھی سر میں چھلانگ نہ لگائی۔ ہمارے کپڑوں نے ہم دونوں کو تکرے رکھلے پروگرام سکندر کا تھا اور اس کا مڑا اشفاق لے رہا تھا۔ وہ تیرتا ہوا ہمارے کنارے پر آکر باہر نکل آیا۔ اس کے سارے کپڑے گیلے ہو کر اس کے جسم سے چمٹ گئے تھے۔ ابھی اشفاق نے ڈاڑھی نہیں رکھی تھی۔ مجھے لگتے ہوئے خیال آتا ہے کہ اگر اس وقت اس کی ڈاڑھی ہوتی تو وہ اسے ہاتھ سے ضرور جھاڑتا۔ گرمی پر رہی تھی۔ لڑ بھی چل رہی تھی۔ ہم ٹا بلیوں کے نیچے سر کے کنارے شعلے شعلے دور نکل گئے۔ اشفاق احمد کے کپڑے تھوڑی دیر میں ہی سوکھ گئے۔ اشفاق کہنے لگا۔

”تم لوگ بھی نہالو۔ یہ موقع پھر ہاتھ نہیں آئے گا۔ لاہور سے

کمال باہر نکلنا ہوتا ہے۔“

مگر ہم دونوں میں سے کوئی بھی نہالے پر راضی نہ ہوا۔ سکندر نے کہا۔

”اشفاق صاحب! میرا کام تو لوگوں کو تیار کر کے میدان میں لانا ہے۔ آگے ان کا اپنا کام شروع ہو جاتا ہے۔ میں وہاں سے واپس چلا جاتا ہوں۔“

سر کے کنارے ٹا بلیوں کی خوشبو سے منک رہے تھے۔ ٹا بلیوں پر اب بھی مٹی کے مہینے میں بور آتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے زرد رنگ کے پھول کھلتے ہیں۔ ان کی خوشبو اڑتی ہے مگر شیخوپورہ روڈ کی طرف سے آنے والی پٹروں کی بو اور اس کا دھواں اس خوشبو کا گلا گھونٹ دیتا ہے۔ تب ایسا نہیں تھا۔ شیخوپورے والی سڑک کی طرف سے بھی ٹا بلیوں کی خوشبو نہیں آتی تھی۔ اس سڑک پر بھی دونوں جانب ٹا بلیوں کے درخت بدلتے سرسبز ہوا کرتے تھے۔ اب یہ درخت ڈیرل کے دھوکے سے کالے پڑ رہے ہیں۔

ہم نے کافی وقت سر کے پرسکون خوشبودار ماحول میں گزارا اور پھر سر کو الدوار کہا اور لاہور کی طرف روانہ ہو گئے۔ اشفاق کہنے لگا۔ ”مجھے تو بھوک لگ رہی ہے۔“

مجھے یاد آگیا کہ بچپن میں جب میں سر میں چھلانگیں لگایا کرتا تھا تو مجھے بھی بعد میں بڑی بھوک لگتی تھی۔

امرتسر سے ہجرت کر کے لاہور آنے کے بعد میرا سب سے پہلا ٹھکانہ گوالہنڈی میں بنا تھا۔ امرتسر کے ہمارے سبھی جاننے والوں اور رشتہ داروں نے لاہور کے اسی علاقے میں مکانات الاٹ کروائے تھے۔ گوالہنڈی کے چوک والے ریستورانوں میں ہماری محفلیں لگتیں۔ رات گئے تک ہم ان چائے خانوں میں بیٹھے امرتسر کے خواتین اور حضرات میں شہید ہونے والوں کی باتیں کرتے۔ پیچھے اپنے جو گھر چھوڑ آئے تھے۔ جو گلیاں، باغ، بازار چھوڑ آئے تھے ان کی باتیں کرتے۔ ان لاشوں کا ذکر کرتے جو ہم نے سڑکوں، ریلوے لائنوں، گلیوں، بازاروں اور نالیوں پر بے گورو کفن پڑی دیکھی تھیں۔ کبھی ساری ساری رات شعر و شاعری اور گانے بجانے میں گذر جاتی۔ گانا بجانا بھی تھا کہ ہمارا ایک دروزی ساتھی تھا جسے بجاتے ہوئے مایا یا مرزا صاحبان سنانا۔ نذرِ ربانی دارغ کی کوئی غزل چھیڑ دیتا۔ اگر ساغر صدیقی کشمیر ہوٹل کی طرف سے پھرتا پھرتا وہاں آ جاتا تو اس سے شعر سنتے۔ ساغر صدیقی ابھی پورے کپڑوں میں ہوتا تھا۔ وہ ابھی سیاہ پوش نہیں ہوا تھا۔ جس نے شراب پینی ہوتی وہ شیو کے ڈیرے کی طرف چل دیتا۔ جو چرس کا رسیا ہوتا وہ وہیں سگریٹ بنا کر سلگاتا مزے سے گھٹ ہو جاتا۔ ہم میں زیادہ تر چائے کے شوقین تھے۔ رات گئے تک چائے کی جھینگیں بھر بھر کرتی رہتیں ہم سب ایک بہت بڑے طوفان سے گذر کر آئے تھے۔ کسی کو اپنے مستقبل کے بارے میں کچھ پتہ نہیں تھا کہ وہ آگے چل کر کیا کرے گا؟ کیا بنے گا؟ سب اسی حال میں مست تھے کہ آپس میں مل بیٹھ کر چائے پیتے ہیں۔ باتیں کرتے ہیں۔ اور رات گذر جاتی ہے۔

ایک روز میں نے اشفاق سے کہا۔
”تم حقیقت پرست ہو۔ اور بڑے اچھے اچھے دلچسپ اور زندہ کردار
اپنے افسانوں میں پیش کرتے ہو۔ میرے ساتھ چلو۔ میں تمہیں
اپنے گوالہنڈی کے دوستوں سے ملاتا ہوں۔ تم ان سے مل کر خوش
ہو گے۔“

چنانچہ ایک شام میں اسے لے کر گوالہنڈی میں آ گیا۔ اس روز میرے
دوستوں کی محفل شیراز ہوٹل میں جمی ہوئی تھی۔ میں نے اشفاق کا اپنے
دوستوں سے تعارف کرایا۔ ان میں سے بہت سوں نے اشفاق احمد کی کمائیاں
پڑھ رکھی تھیں۔ وہ اشفاق سے مل کر بڑے خوش ہوئے۔ اس کے لئے ڈبے
کی چائے کا آؤر دیا۔ یہ خاص دودھ پتی والی چائے ہوتی ہے جس کی پیالی میں
اوپر ملائی کی تر جمائی جاتی ہے۔ شفیع کے ہوٹل سے کھنڈ تلے منگوائے گئے
اشفاق کھنڈ تلے غور سے دیکھنے لگا۔

”یہ خطائیاں تو بڑی صحت مند ہیں۔“
ضیاء بٹ نے ہن کر کہا۔
”سرتی! یہ خطائیاں نہیں ہیں۔ یہ امرتسری کشمیریوں کی خاص
سوغات ہے انہیں کھنڈ تلے کہتے ہیں۔ یہ قوے کے ساتھ کھائے
جاتے ہیں۔ لیکن آپ لپٹن چائے کے ساتھ بھی اس کا مزالے
سکتے ہیں۔“

ضیاء بٹ کو ہم جاوا کہہ کر بلاتے تھے وہ کشمیری شالوں کی کڑھائی یعنی
ٹپا اور رنوکری کا بہترین کاریگر تھا۔ میں نے اسے اپنے دوست شہنوش بھی
ملایا جو گوالہنڈی کے چوک میں گریسوں میں برف اور ہریوں میں مچھلی بیچتا
تھا۔ بعد میں اس نے چوک میں اپنی دکان خرید لی اور سگریٹ کی انجینی بھی
بنے لی۔ شہنوش ساغر صدیقی کا ذریعہ دوست مداح تھا اور اس نے اپنی دکان میں ساغر
صدیقی کی ایک تصویر شیشے کے فریم میں جڑوا کر لگا رکھی تھی۔ میں نے اشفاق

احمد کو اپنے امرتسری دوست اعظم کے چھوٹے بھائی قاسم سے بھی ملایا۔ قاسم کو بد معاش بننے کا بڑا شوق تھا۔ اس نے اس فن میں مہارت حاصل کرنے کے لئے بستہ الف کے ایک نامی گرامی بزم معاش کی شاگردی اختیار کر رکھی تھی۔ قاسم کی عمر ابھی چھوٹی تھی مگر وہ اپنی جیب میں کمائی دار چاقو رکھتا تھا۔ جسے وہ وقت بے وقت جیب سے نکال کر کھولتا۔ اس چاقو کے کھلنے سے آواز پیدا ہوتی تھی۔ قاسم نے اشفاق کے سامنے کمائی دار چاقو کھولا تو اشفاق نے پوچھا۔

”بھی تمہاری اتنی چھوٹی سی عمر ہے اور تم نے اتنا بڑا چاقو اپنے پاس رکھا ہوا ہے۔“

قاسم نے اتنے بڑے چاقو سے چھوٹا سا امروہ کاٹے ہوئے کہا۔

”اپنا اپنا شوق ہوتا ہے جی۔“

گواہنڈی کے چوک میں ہمارا ایک اور مشترکہ دوست رہا کرتا تھا۔ اس نے جس حروکہ کسٹری میں مکان الاٹ کروایا تھا وہاں آج کل پر تنگ پریس لگے ہوئے ہیں۔ اس شاعر دوست کے مکان کی کوئی بیڑھی نہیں تھی۔ مکان دوسری منزل پر تھا نیچے مٹی کا ٹیلا سا بنا ہوا تھا۔ اس کے مکان پر کوئی نئے والا آتا تو شاعر اوپر سے رستے کی بیڑھی نیچے لٹکا دیتا تھا۔ مہمان جان کا خطرہ مول لے کر رسی کی بیڑھی کے ذریعے کھڑکی میں سے مکان میں داخل ہوتا۔ ہم اس سے ملنے اس کے مکان پر بھی نہیں گئے تھے۔ سامنے کشمیر ہوٹل میں ہی اس سے گپ شپ کر لیتے تھے۔ ہمارے اس شاعر دوست میں یہ بات بڑی اچھی تھی کہ وہ ہمیشہ دوسروں کے شعر سناتا تھا۔ اپنے شعر صرف تنہائی میں گنگنایا کرتا تھا۔

گواہنڈی کے شیراز ہوٹل میں ہی میں نے اشفاق کو نو عمر بے باک مگر مہمان صحافی حضرت سے بھی ملایا۔ آگر میں بھولتا نہیں ہوں تو اس کا نام یا تجلّص حضرت ہی تھا۔ دہلا پٹلا سوکھنا سا کھانا نوجوان لڑکا تھا۔ اسے فی لی کا مرض ہو

تھا۔ اپنے چائے ہی پارک والے گھر پر ہی خبریں بتاتا۔ ان کی کلیاں کرتا اور زمانے کے اخباروں کے دفتر میں جا کر خود ہی دے آتا۔ جیمیرسن والے کتب میں ایک حروکہ بلڈنگ میں اخبار ”سینہ“ کا دفتر ہوتا تھا۔ اس اخبار کا ایڈیٹر وقار انبالوی تھے۔ اشفاق احمد جس روز میرے ساتھ گواہنڈی میں آئے ہم وقار صاحب سے ملاقات کرنے ان کے دفتر بھی جاتے۔

میرے گواہنڈی کے امرتسری دوستوں میں ایک پیر جی بھی تھا۔ وہ کوئی رنگ نہیں تھا۔ ہماری عمر کا نوجوان ہی تھا۔ مگر سب اسے پیر جی کہتے تھے۔ پیر جی نے کوئی امتحان پاس نہیں کیا تھا۔ مگر وہ پرائمر کے بارے میں تمام نوٹی نکات کا ماہر تھا۔ کوئی شخص جرم کر کے اس کے پاس آتا تو پیر جی اسے ایسے کہتے جتنا کہ مجرم بھی حیران رہ جاتا۔ اور اکثر اوقات شناخت پر رہا ہی ہو جاتا۔

گواہنڈی میں ہمارے ایک دوست کی شادی تھی۔ اس نے اشفاق کو ی دعوت نامہ دیا اور کہا۔

”سری آپ بھی ضرور آئیں۔ مجھے بڑی خوشی ہوگی۔“

اشفاق احمد نے کہا۔

”میں ضرور آؤں گا۔ عید کے ساتھ ہی آؤں گا۔“

میں اشفاق کو شادی سے ایک رات پہلے بھی وہاں لئے نہ گیا۔ ہمارے دوست نے موسیقی کی محفل سجائی تھی مکان کے صحن میں دریاں بچھی تھیں۔ ڈاؤنگلے لگے تھے۔ ہمارے سب دوست بیٹھے ایک دوسرے سے ہنس ہنس کر بات کر رہے تھے۔ کہیں شعر و شاعری پر باتیں ہو رہی تھیں گانے والوں میں زیرِ دہائی اور نڈیر ٹیلر ماسٹر پیش پیش تھے۔ ہمارا دوست امرتسری کشمیری تھا۔ اس نے خاص طور پر ساک، ممی کی دیک، کچوائی تھی۔ پہلے سبز کشمیری چائے کا ور چلا۔ ساتھ باقر خانیاں بھی تھیں۔ دس بجے رات کو دیک کا منہ کھل گیا اور سب نے مزے لے لے کر سفید چاولوں کے ساتھ ساک، ممی کھائی۔ پھر

جائے آئی۔ جائے کے بعد شعوی دکان سے پان کے قہال آگئے۔ سگریٹ
سٹاک لئے گئے اور سب سے پہلے نذیر ٹیلر ماسٹر نے گھرے پر مایا بنایا۔ پھر
سامعین کی فرمائش پر پنجابی فلموں کے دو گیت خانے جو اس زمانے میں بڑے
مقبول تھے۔ مثلاً

سوئے چوڑے والے

نی اک واری آجا

سانوں بکھرا دکھا جا

اس کے بعد نذیر ربانی نے اپنی شریلی آواز میں استادہ کا کلام سنانا
شروع کیا۔ نذیر ربانی لے کاری اور شہزاد شاہ تھا۔ رات بھر یہ محفل جاری
ری۔ رات کے کوئی تین بجے اشفاق نے میری طرف جھک کر کہا۔

”یار! اب چلنا چاہیے۔ بڑی دیر ہو گئی ہے۔“

میں نے کہا۔

”اب جا کر کیا کرو گے۔ رات تو گزر ہی گئی ہے۔ صبح ہرے اور

قلے کا ہشتہ کر کے چلے جانا“

مگر اشفاق احمد نہ رکا۔ میں اسے کسی بہانے محفل سے اٹھا کر باہر بازار
میں لے آیا۔ خوش بیمار کا موسم تھا۔ پچھلے پیر کی ٹھنڈی خوشگوار ہوا چل رہی
تھی۔ جیسیر لیمن کے چوک سے ہمیں ایک خالی ٹانگہ مل گیا۔ اشفاق کو رخصت
کر کے میں زندہ دلاں امرتسر کی محفل میں واپس آیا تو ضیاء بیٹ نے دور سے
بلند آواز میں پوچھا۔

”اشفاق صاحب چلے گئے کیا؟“

میں نے کہا۔

”ہاں یار! انہیں صبح جلدی اٹھنا تھا“

نذیر ٹیلر ماسٹر نے کہا۔

”اب اٹھنے کی ضرورت ہی کہاں تھی“

دوسرے دن بارش تھی۔ اشفاق بھی برات میں میرے ساتھ تھا۔
دولہا کی طرف سے کشمیری بابے کا خاص طور پر اہتمام کیا گیا تھا۔ ابھی لاہور
میں امرتسر کے کشمیری بیٹے والے موجود تھے اور کشمیریوں کی برات میں انہیں
ضرور بلایا جاتا تھا۔ برات کو گوالمنڈی سے نسبت روڈ تک ہی جانا تھا۔ مگر اس
نے بڑے ڈاک خانے کی طرف سے ہو کر ساری میکھوڑ روڈ کا چکر لگایا۔ آگے
آگے کشمیری باجا تھا۔ بوسکی کی شلوار قبضوں میں ملبوس کشمیری نے نواز
قراقلی کی نوبیاں اپنے ٹھٹھا بیاں اور شہنائیاں بجاتے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے
چلے جا رہے تھے۔ ان کے پیچھے سوہنی کا روایتی بیٹہ تھا۔ لڑکی والے بھی
امرتسر کی کشمیری تھے۔ جب برات لڑکی والوں کی گلی میں داخل ہوئی تو کشمیری
بیٹہ بچ رہا تھا۔ برات پر پیسے لٹائے گئے۔ گلی میں تہو تہیں گئی تھیں۔ دوسری
طرف دیکھیں دم ہو رہی تھیں۔ لڑکی والے اور لڑکے والے سب ایک
دوسرے کو جانتے تھے۔ کھانا منی ٹائی نے پکایا تھا۔ وہ بھی امرتسر کا تھا۔ براتی
تہو کے نیچے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ میری ایک جانب اشفاق بیٹھا تھا دوسری
طرف گوالمنڈی کے مشہور آڑھتی حاجی صاحب بیٹھے تھے۔ منی ٹائی دیکھیں
چھوڑ کر دوڑتا ہوا آیا اور حاجی صاحب کی طرف جھک کر بیوی رازداری کے
ساتھ بولا۔

”حاجی صاحب! بڑا ڈل وار زروہ پکایا ہے میں نے۔۔۔ ذرا کچھ کر

باتا“

یہ کہا اور حاجی صاحب کا جواب سنے بغیر جیسے آیا تھا ویسے ہی تیز تیز
قدموں سے واپس چلا گیا۔ اشفاق میری طرف دیکھ کر ہنسنے لگا۔ زروہ واقعی اس
نے بڑے کمال کا پکایا تھا۔ شام کو دلمن کی ڈولی روانہ ہوئی تو اس پر سے بھی
پیسے اور انکیاں دونیاں لٹائی گئیں۔ جب تک ڈولی نسبت روڈ پر رہی آگے
آگے کشمیری باجا ہی بچتا رہا۔ جب برات چوک میں پہنچی تو میں نے اور اشفاق
نے پیچھے ہٹنا شروع کر دیا اور پھر سب کی آنکھ بچا کر وہاں سے کھسک گئے۔

گواہی دیتی تھی کہ چوک سے شاہ ابوالمعالی کی طرف آئیں تو آگے جا کر ایک گلی بائیں ہاتھ کو مڑتی ہے۔ اس گلی میں میرے ایک باذن اور خوبصورت باتیں کرنے والے امرتسری دوست کا مکان تھا۔ اس کا نام طفیل تھا۔ طفیل کو ادب اور موسیقی سے زبردست لگاؤ تھا۔ اس نے جب سنا کہ اشفاق احمد شیراز ہوٹل میں میرے ساتھ آتا جاتا ہے تو وہ ایک دن صبح میرے مکان پر آ گیا۔ مکانوں پر ان دنوں پھینٹیاں کھائی جاتی تھیں۔ گلی میں سے آواز دے کر بلایا کرتے تھے۔ طفیل نے بھی نیچے سے مجھے آواز دی۔ دوسری یا تیسری آواز پر میں نے کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا۔ نیچے طفیل نے جگت لگاتے ہوئے کہا۔

”مولانا! نیچے آ جاؤ۔ بڑی سیر سناٹ بات کرنی ہے۔“
طفیل کی اپنی ڈکشن تھی۔ وہ اپنی گفتگو میں مفہوم ادا کرتے ہوئے نئی نئی سائنسی ایجادات کے لفظ اور اصطلاحیں بے دریغ استعمال کرتا تھا۔ اب اگر میں اس کے ڈائیلاگ لکھتے وقت کوئی اصطلاح بھول جاؤں تو درگزر کر دیجئے گا۔

میں گلی میں آیا تو طفیل تھوڑی دیر تک گردن پیچھے کئے بالکل سیدھا کھڑا میری طرف دیکھ کر مسکراتا رہا پھر بولا۔

”خواجہ حبیب! یہ بات ٹھیک نہیں ہے اشفاق احمد صاحب گواہی دیتی ہیں کہ آئیں اور ہماری ان سے تو تو میں میں نہ ہو؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

میں نے اسے بتایا کہ اشفاق میرے ساتھ یہاں آتا ہی رہتا ہے اسے لے کر میں ہمارے پاس بھی ضرور آؤں گا۔ طفیل نے قہقہہ لگایا۔
”تو پھر بس سکشن آج دہرے کو ہی ہو جانا چاہیے۔ انہیں ایسے دیدہ زیب کرے کہ گوشت کھلاؤں گا کہ امرتسر کا نقشہ سامنے آ جائے گا۔“
میں نے کہا۔

”یار پتہ نہیں آج دہرے کو اس کی کیا مصروفیات ہیں۔ مجھے پہلے اس سے مل کر طے کر لینے دو۔“

طفیل نے ایک ہاتھ اپنے کان کو لگایا اور بلند آواز میں بولا۔
”خواجہ حبیب! خدا کو جان دینی ہے اس معاملہ ڈن ہو گیا۔ شو شیک پیک اپ میں ابھی حاجی صاحب سے ہٹھ کا گوشت لے جا رہا ہوں۔“

میں اسے آوازیں ہی دیتا رہ گیا اور طفیل پیچھے دیکھے بغیر ہاتھ سے نفی میں اشارے کرتا آگے نکل گیا۔ میں جلدی جلدی ٹھہر کر سیدھا اشفاق کے گھر پہنچا اور اسے کہا کہ دہرے کا کھانا گواہی دیتی ہیں کہ گھر ہے۔ میں نے اشفاق کو راضی کر لیا۔ دہرے تک میں اس کے ساتھ ہی رہا۔ کوئی ساڑھے گیارہ بجے کے قریب میں اسے لے کر گواہی دیتی آ گیا۔ گلی میں طفیل کے گھر کے نیچے کھڑے ہو کر میں نے اسے آواز دی۔ مجھے کی جتنی اطلاع اس نے مجھے اور اشفاق کو دیکھا اور وہیں سے بازو اوپر اٹھا کر بولا۔

”وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے میں نیچے لینڈ کر رہا ہوں۔“

اشفاق احمد سے طفیل بڑی گرجوشی سے بولا۔ اس کے افسانوں کی اپنی خاص زبان میں تعریفیں کرنے لگا۔

”بڑے ہم بائٹک افسانے لکھے ہیں آپ نے اشفاق حبیب اس سے بہتر۔“
گھر لائٹ کرا لیا ہے۔ اوپر تشریف لائیں۔“
ہم دوسری منزل کے کمرے میں آ کر پرانے صوفوں پر بیٹھ گئے۔ طفیل کو موسیقی کا بے پناہ شوق تھا۔ ایک ریکارڈ پلیئر اس نے رکھا ہوا تھا۔ لہذا گیتا رائے اور جو تھیکا رائے سنگھ اور سنگھ ملک کے لائٹ پلے ریکارڈ اس نے بڑی جگہ دہرے کر کے جمع کئے ہوئے تھے۔ اشفاق کی طرف دیکھ کر اس نے کہا۔
”اجازت ہے سر۔“

اور اس نے میوزک ڈائریکٹر سجاد کی بنائی ہوئی دھن میں گیتا رانے کا
گایا ہوا ایک ریکارڈ لگا دیا۔
درشن پراسائی آئی داسی
جک جک ویپ جلائے
پر بھو چرن کی دھول ملے تو
جیون میں سکھ پائے

ریکارڈنگ کے ساتھ گفتگو بھی جاری رہی۔ طفیل نے افسانوی ادب پر
جب اپنے مخصوص انداز میں تبصرہ شروع کیا تو اشفاق بڑا متاثر ہوا۔ پھر تھوڑی
دوئیاں کر کے گوشت دہی اور خربزے آ گئے۔ اس کے بعد سبز کشمیری
چائے کا دور چلا۔ طفیل بڑا خوش تھا۔ اس نے اپنے ایک اور دوست کو بھی
مدعو کیا ہوا تھا۔ وہ دوست زیادہ تر خاموش رہا۔ لیکن ہر کسی کی بات پر سر ہلا کر
اس کی بات میں ہاں ضرور بھرتا۔ اگر اشفاق کوئی بات کر رہا ہو تا تو یہ خاموش
دوست اس کی طرف ٹکٹکی باندھے ٹکٹا رہتا اور اس کے چہرے پر الفاظ کے
مطابق خاموش تاثرات ابھرتے رہتے۔ جب اشفاق فیصلہ کن انداز میں کسی
بات کی تصدیق یا نفی کرتا تو خاموش دوست فوراً یوں سر ہلا دیتا جیسے کہہ رہا
ہو۔ بات ہوئی نا۔ آپ کو ایسا ہی کرنا چاہیے تھا۔ طفیل نے ایک بار اس کی
طرف اشارہ کر کے اشفاق سے کہا کہ میں اسے خاموش فلموں میں سے نکال کر
لاؤں ہوں۔ جب ہم رخصت ہونے گئے تو طفیل نے میرا شکریہ ادا کیا۔ اشفاق
کے ساتھ بڑی گرجو ششی سے ہاتھ ملایا اور اس کا بار بار شکریہ ادا کرتے ہوئے
بولے۔

”اشفاق صاحب! بتول سعادت حسن منٹویہ بڑی سبب ٹولہ دعوت
تھی“

ہم گوالہٹی کی گلیوں میں سے گزرتے میٹرو روڈ کی طرف جا رہے
تھے۔ اشفاق کہنے لگا۔

”یار اکیسے کیسے تلوڑ نہاںہ لوگ ان گلیوں میں رہتے ہیں۔“
میرا فلمی دنیا کے ساتھ بھی ایک سلسلہ بن گیا تھا۔ اس عہد کے نامور
اور کامیاب فلم ڈائریکٹر اور پروڈیو سرانور کمال پاشا نے مجھے اپنے یونٹ میں
لے لیا تھا۔ وہاں میرے بڑے دوست بن گئے تھے۔ ایک افسانہ نگار کی حیثیت
سے بھی لوگ مجھ سے بڑا پیار کرتے تھے۔ ان میں میرے ہم عمر بھی تھے اور
مجھ سے بڑی عمر کے بزرگ بھی شامل تھے۔ میری اکثر راتیں فلمی ماحول میں
کسی سٹوڈیو میں سیٹ پر گزرتی تھیں یا قاعدہ کوئی فلم تو نہیں لکھ رہا تھا لیکن
پاشا صاحب کے لئے کسی نہ کسی سکرپٹ پر کام ضرور کرتا رہتا تھا۔ فلم کے لئے
لکھنے کا میرے دل میں کوئی زیادہ شوق بھی نہیں تھا۔ میری ساری توجہ محبتیں
کرنے اور ان مہیوں کے بارے میں افسانے ناول اور ٹولٹ وغیرہ لکھنے کی
طرف تھی۔ لیکن اٹھنا بیٹھنا فلم کے لوگوں کے ساتھ ضرور تھا۔ رائل پارک
ان دنوں فلمی دنیا کا اہم ترین مرکز تھا۔ یہاں کے برشل اور ویسٹ اینڈ ہوٹل
میں اس زمانے کی بڑی اہم فلمی شخصیتیں اکٹریٹھ کرتی تھیں۔ ایسے نوجوان
بھی آکر بیٹھتے تھے جو بعد میں بڑے نامور ہیرو اور فلم کے پروڈیو سر بنے اور
جنہوں نے بڑا نام پیدا کیا۔

قیام پاکستان سے پہلے رائل پارک کے فلمی دفاتر پر ہندوؤں کی اجارہ
داری تھی۔ اگرچہ اداکار اور ڈائریکٹر زیادہ تر مسلمان ہی تھے۔ جو ہر کمال کی
سپلائی بھی مسلمان ہی کرتے تھے۔ پاکستان بنا تو ہندو چلے گئے اور رائل پارک
کے دفاتر اور عمارتیں مسلمان مساجدوں کو الاٹ ہوئے گئیں۔ آج کل تو یہاں
زیادہ تر فلمی دفاتر ہی قائم ہیں مگر شروع شروع میں ہر طبقے کے لوگ یہاں آکر
آباد ہو گئے تھے۔ ایک بلڈنگ کی پہلی منزل ہمارے ایک جاننے والے
عبدالتین صاحب نے اپنے نام الاٹ کرائی تھی۔ مجھے یاد ہے اس کے کمرے
بالکل خالی تھے۔ ایک بڑے کمرے میں صرف ایک صوفی پڑا تھا۔ یہاں کچھ
روز میں احمد رائی اور ساحر لدھیانوی ایک ساتھ رہے تھے۔ بحر مال پھر یہ

بلڈنگ ہمارے ہاتھ سے نکل گئی اور اب وہاں سرکاری دفاتر قائم ہیں۔
اس رائل پارک کی گلیوں میں ہر قسم کے لوگ رہا کرتے تھے۔ کوئی
جانور تھا۔ کس کا کی تعلق ضلع گورداسپور ہو شیار پوزیا میرٹھ سے تھا تو
کوئی کسی گاؤں سے ہجرت کر کے آیا تھا۔ یہیں ایک گلی میں ضلع امرتسر کے
ایک بزرگ بھی آکر رہنے لگے تھے۔ وہ اپنے ایک بیٹے کے ساتھ رہتے تھے۔
بیٹا اوپر والی منزل پر رہتا تھا۔ بزرگ نے گلی والے چھوٹے سے کمرے میں اپنی
چارپائی بچھالی تھی۔ یہ لوہے کی جھپٹالوں والی چارپائی تھی۔ سامنے دو تین
لوہے کی کرسیاں پڑی رہتیں تھیں۔ ان بزرگ کی عمر اس وقت ستر کے قریب
ہوئی مگر دہلے پتے کے جسم میں بڑی توانائی بھری ہوئی تھی۔ باہر کم ہی نکلتے تھے۔
زیادہ وقت چارپائی پر شیم دراز ہو کر پرائی کتب کے مطالعے میں صرف کرتے۔
انہیں نجوم کے علم پر بھی کافی عبور حاصل تھا۔ مشرقی علوم بھی اذکر کر رکھے
تھے۔ میری شہریت ہی سے یہ عادت رہی ہے کہ میں صاحب علم لوگوں کا بیوا
لوہ کرتا ہوں اور جہاں کہیں ان کا کوئی سرالخٹے ملے تو ان کے پاس کم از کم
ایک مرتبہ ضرور جاتا ہوں۔ میں ایک دن رائل پارک کے برشل ہوٹل میں
بیٹھا تھا کہ ایک آدمی نے اس بزرگ کا ذکر کیا۔ ان کا اصلی نام تو مجھے کبھی بھی
معلوم نہیں ہو سکا۔ سب لوگ احترام سے انہیں شاہ جی کہہ کر مخاطب کرتے
تھے۔ وہ آدمی کہنے لگا۔

”شاہ جی اس دور کے بڑے پختے ہوئے بزرگ ہیں۔ عربی فارسی کے
ساتھ انگریزی بھی بولتے ہیں۔“

اس آدمی نے کچھ اس انداز میں شاہ جی کی باتیں کیں کہ میرے دل
میں ان سے ملنے کی ذبردست خواہش پیدا ہو گئی۔ چنانچہ میں اس روز شام سے
ذرا پہلے شاہ جی کے دولت خانے پر پہنچ گیا۔ مجھے یہ بھی بتا دیا گیا تھا کہ وہ بہت
کم کسی سے ملتے ہیں۔ اگر کسی سے ملنا ناگزیر ہو جائے تو مختصر بات کر کے
مہمان کو رخصت کر دیتے ہیں۔ میں نے ان کی بیشک کے دروازے پر دستک

دی تو اندر سے بڑی تیز اور کرخت آواز آئی۔

”کون ہے بھئی؟“

میں نے کہا۔

”شاہ جی! میں ہوں۔ آپ سے ملنے آیا ہوں۔“

اسی لمحے اور اسی کرخت لمحے میں اندر سے آواز آئی۔

”جاؤ جاؤ بھائی اپنا کام کرو۔ میرے پاس کسی سے ملنے کا فضول وقت
نہیں ہے۔“

میں ہنس پڑا۔ واقعی یہ آدمی امرتسر کے ضلع کا ہی رہنے والا ہو سکتا تھا۔

میں بھی امرتسر شہر کا پانی پی کر جوان ہوا تھا۔ میں نے فوراً جواب دیا۔

”شاہ جی! اگر آپ لوگوں سے نہیں ملتے تو پھر شہر میں کیوں بیٹھے

ہیں۔ جنگل کیوں نہیں چلے جاتے۔ یہاں بیٹھیں گے تو آپ سے

محبت کرنے والے آپ کے پاس ضرور آئیں گے۔“

اس کا اندر سے کوئی جواب نہ آیا۔ اندر سے کسی نے کنڈی اتاری۔

پھر دروازہ کھلا۔ اور میرے سامنے ایک دیلا پٹلا بوڑھا کھڑا تھا جس کا چہرہ تانبے

کی طرح چمک رہا تھا۔ وہ یہی شاہ جی تھے۔ ان کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔

مجھ سے پوچھا۔

”کیا تم امرتسری ہو؟“

میں نے کہا۔

”جی ہاں! خاص امرتسر شہر کا رہنے والا ہوں۔“

شاہ جی نے ہاتھ کے اشارے سے کہا۔

”آ جاؤ یا ر اندر۔“

چھوٹا سا کمرہ تھا۔ لوہے کا پلنگ دیوار کے ساتھ لگا تھا۔ دیواریں بالکل

خالی تھیں۔ کوئی کیلنڈر تک نہیں لگا تھا۔ پلنگ کے پاس فرش پر مٹی کی صراحی

پڑی تھی جس کے اوپر تانبے کا گلاس اونڈھا رکھا ہوا تھا۔ پلنگ کی ایک جانب

پرانی کتابیں ایک دوسرے کے اوپر رکھی ہوئی تھیں۔ شاہ جی پنگ پر غم دروازہ ہو گئے۔

”کیا ہنوسے بھائی؟ چائے منگواؤں؟“

میں نے کہا۔

”جی نہیں شکریہ میں تو صرف آپ کا دیدار کرنے آیا ہوں“

شاہ جی ہلک کر بولے۔

”کیوں بھائی! میں کوئی فلم ایکٹریس ہوں کہ جس کا دیدار کرنے آ گئے ہو؟ میں نے جنہیں صرف اس لئے اندر بلا لیا ہے کہ اس ترس

کے رہنے والے ہو۔ تناؤ کیا ہو گئے؟ چائے پی لوند نہیں بھی چائے پینا چاہتا ہوں“

انہوں نے کڑا کے دار آواز دے کر اوپر کسی کو کہا کہ چائے لے آؤ۔

پھر ایک پرانی کتاب کی ورق گردانی کرنے لگے۔ میں لوہے کی کرسی پر خاموش بیٹھا ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ شاہ جی نے ورق گردانی کرتے کرتے کتاب ایک دم بند کر دی اور میری طرف اپنی عقلمانی آنکھیں اٹھا کر پوچھا۔

”اگر ترسے تم لوگ صحیح سلامت آ گئے تھے؟ کوئی قتل و قتل تو نہیں ہوا؟“

میں نے کہا۔

”جی نہیں۔ ہم سب لوگ خیر خیریت سے لاہور پہنچ گئے تھے۔“

شاہ جی نے سر ہانے کے نیچے سے کنگ شارک کی ڈبی نکال کر سرگرم

سلاکایا۔ ایک لمبا کش لیا اور اس کا دھواں چھوڑتے ہوئے بولے۔

”بڑا قتل عام ہوا ہے۔ اچھا یہ بتاؤ تمہیں میرا پتہ کس نے بتایا؟“

میں نے اس آدمی کا نام بتا دیا جس نے شاہ جی کا ذکر میرے آگے کیا تھا۔ کہنے لگے۔

”بڑا گدھا ہے۔ ہر کسی کے آگے میرا ذکر لے بیٹھتا ہے اور پھر

لوگ مجھے جگ کرنے آ جاتے ہیں“

میں شرمندہ سا ہو گیا۔ دل میں خیال آیا کہ اٹھ کر واپس چلا جاؤں۔

لیکن پھر یہ سوچ کر بیٹھا رہا کہ یہ قلندر ٹائپ کے لوگ ہوتے ہیں۔ ان کی اپنی

الگ ادائیں ہوتی ہیں۔ اگر ان سے کچھ حاصل کرنا ہے تو پھر یہ ادائیں

برداشت کرنی پڑیں گی۔

اتنے میں اوپر سے ایک لڑکا چائے لے کر آ گیا۔ اس نے کوئے والی

چھوٹی سی میز گھسیٹ کر سامنے کی اور اس پر چائے رکھ کر بغیر کوئی بات کہنے اوپر

چلا گیا۔ شاہ جی ابھی تک مٹالے میں منہمک تھے۔ اچانک میری طرف دیکھا

اور حکم دیا۔

”بھائی چائے کیوں نہیں پیتے۔ میری پیالی میں آدھی چائے

ڈالتا۔“

میں نے شاہ جی کی پیالی میں آدھی چائے ڈالی۔ اپنی پیالی بھی پوری نہ

بھری۔ کیونکہ کوئی پتہ نہیں تھا چائے کیسی بنی ہوئی ہے۔ چائے کے مٹالے میں

میری بھی اپنی قلندرانہ ادائیں ہیں۔ شاہ جی چائے کی پیالی پکڑ کر پنگ پر

سیدھے ہو کر بیٹھ گئے ایک بار پھر کڑک دار آواز میں کہا۔

”اونٹے کوئی ہسکت وغیرہ بھی لے آیا کرو۔“

پھر یہ بڑانے لگے۔ کسی کو گالی دے کر کہا۔

”کوئی نہیں پوچھتا۔ نہ پوچھو۔ میں کہاں تم لوگوں کی پروا کرتا ہوں۔

جہاں جاؤں گا لوگ میرے گرد جمع ہو جائیں گے۔ تمہاری خوش

قسمتی ہے تمہارے گھر میں بیٹھا ہوں۔“

میں کچھ عجیب سا محسوس کر رہا تھا۔ جیسے میں شاہ جی کے گھریلو معاملات

میں دخل دینے وہاں آ گیا ہوں۔ اچانک شاہ جی نے میری طرف آنکھیں اٹھا کر

دیکھا اور کہا۔

”میں نہیں بھائی! تم اپنے دل میں ایسا خیال نہ لاؤ۔ تم محض محبت

کے خیال سے میرے پاس آ گئے ہو۔ میں جانتا ہوں تمہیں صرف میری باتیں سننے کا ہی شوق یہاں کھینچ لایا ہے۔ اچھا بتاؤ۔ تم کس قسم کی باتیں سننا چاہتے ہو؟
میں کھیلانی سی ہنسی ہنس کر بولا۔

”آپ جو بھی باتیں کریں گے میں انہیں بڑے شوق سے سنوں گا“
اس پر شاہ جی ہنس پڑے۔ میں نے دیکھا کہ ان کے مارے وائٹ اس عمر میں بھی اصلی تھے اگرچہ پان کمانے کی وجہ سے میلے لگ رہے تھے۔ میں نے یونہی ان سے ان کی عمر پوچھی تو انہوں نے فوراً کہا۔
”میری عمر کسی کوئی دو چار سو سال ہوگی“

میں ہنس دیا۔ کہنے لگے۔

”ہستے ہو؟“ وہ سنجیدہ ہو گئے۔ ”تمہارا خیال ہے کہ میں مذاق کر رہا ہوں؟ بھائی میرا تمہارا کوئی مذاق نہیں ہے۔ میں نے جہیں جو اپنی عمر بتائی ہے میں اتنی ہی عمر کا ہوں“
شاہ جی نے سگریٹ فرش پر پھینکا اور مجھ سے کہا۔
”اس پر پاؤں مار کر بچھاؤ“

میں نے ایسا ہی کیا۔ تب میں نے دیکھا کہ فرش پر سگریٹ بجھنے کے کئی نشان پڑے ہوئے تھے۔ شاہ جی کے لئے میں نے چائے کی دو ستری پائی بنائی تو بڑے خوش ہوئے۔ کہنے لگے۔

”تمہیں کیسے پتہ چلا کہ میں چائے کی دو بیالیاں ایٹ اے ٹائم پیتا ہوں؟“

میں نے کہا۔

”بس دل کو دل سے راہ ہوتی ہے“

یولے ”سبحان اللہ“ شاہ جی کی زبان سے بے اختیار یہ کلمہ نکل گیا۔
”تم نے میری روح راضی کر دی۔ اچھا۔ میں تمہارا زانچہ بناتا

ہوں۔ جو پوچھو گے زانچہ بتائے گا۔ بولو۔ تمہاری تاریخ پیدائش کیا ہے؟“

میں نے کہا۔

”شاہ جی! اگر تاریخ پیدائش ہی معلوم کرنی ہے تو پھر آپ کے زانچے بتائے گا قاعدہ کیا؟“

اس پر شاہ جی ایک دم سنجیدہ ہو گئے۔ وہ مجھے گھور گھور کر دیکھتے رہے۔ پھر پوچھا۔

”کیجئے گا وہ بات تمہیں کس نے بتائی ہے؟“

میں نے کہا۔

”یقین کریں شاہ جی! مجھے کسی نے نہیں بتائی۔ بس یونہی دل میں خیال آ گیا تھا“

شاہ جی نے کنگ مبارک کا نیا سگریٹ لگایا۔ تبھی ہوئی تیلی فرش پر پھینکی اور سگریٹ کا گھرا کش لگا کر بولے۔

”اچھا۔ بدخوردار اب تم جاؤ۔ پھر کسی وقت آنا۔“

میں سلام کر کے دروازے کی طرف بڑھا تو شاہ جی نے کڑک کر کہا۔
”جب بھی آنا اسی وقت آنا۔ اور دروازے پر زور سے ہاتھ نہ مارنا۔ سمجھ گئے؟“

میں نے کہا۔

”جی سمجھ گیا“

شام کے وقت اشفاق احمد سے ملاقات ہوئی تو میں نے اپنے شاہ جی کی دلچسپ شخصیت کے متعلق بتایا تو وہ کہنے لگا۔

”کل میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا“

اشفاق احمد کو تصوف کے مسئلے مسائل سننے اور بیان کرنے کا شروع ہی سے بڑا شوق تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ شاہ جی سے مل کر بڑا خوش ہوگا۔ چنانچہ میں وقت مقررہ پر اسے ساتھ لے کر شاہ جی کے مکان پر پہنچ گیا۔ شاہ جی کی ہدایت کے مطابق میں نے دروازے پر آہستہ سے دستک دی۔ دو سری دستک پر شاہ جی نے خود دروازہ کھولا۔ ہمیں ایسے دیکھا جیسے پچانے کی کوشش کر رہے ہوں۔ پھر انہوں نے مجھے پہچان لیا اور اندر آنے کا اشارہ کر کے واپس چلے گئے۔ اشفاق احمد نے مجھے شرارتی نظروں سے دیکھا۔ میں نے کہا۔

”آجاؤ! یہی شاہ جی ہیں۔“

ہم نے کمرے میں جا کر شاہ جی کو سلام کیا۔ انہوں نے سر کے اشارے سے سلام کا جواب دیا اور بیٹھے کا اشارہ کیا۔ آج ساری باتیں اشاروں میں ہو رہی تھیں۔ میں اور اشفاق کوہے کی کالی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ مارج کا مینہ تھا۔ کمرے کی افنا خوشگوار تھی۔ شاہ جی پنگ سے ٹیک لگائے کسی بوسیدہ سی کتب کے مطالعے میں منہمک تھے۔ ہم خاموش بیٹھے رہے۔ شاہ جی ہنس پڑے۔

”واو! کیسا غلط شعر لکھا ہے اس شاعر نے۔“

پھر کتاب بند کر دی اور اشفاق احمد کی طرف متوجہ ہوئے۔

”اچھا تو آپ ہیں افسانہ نگار اشفاق احمد؟“

اشفاق احمد شرمیلی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

”ہاں جی بس تھوڑا بہت لکھ لیتا ہوں۔“

شاہ جی تھک کر بولے۔

”بھائی یا تھوڑا لکھو یا بہت لکھو۔ یہ تھوڑا بہت کیا ہوا؟“

تصوف کی باتیں شروع ہو گئیں شاہ جی کہنے لگے۔

”یہ تصوف جس کا ذکر عام لوگ کرتے ہیں آج تک میری سمجھ میں

نہیں آیا۔ اچھا بھائی اشفاق احمد تم بتاؤ۔ تم تصوف کسے سمجھتے ہو؟“

اشفاق احمد نے جواب میں کچھ کہا۔ شاہ جی بڑے غور سے سنتے رہے۔

”اوپر والوں نیچے چائے بھجوا دو۔“

ہم کرسیوں پر بیٹھے بیٹھے کانپ سے گئے۔ اشفاق احمد کے ہاتھ سے بات کا سرا نکل گیا۔ اس نے دماغ پر دور دے کر یاد کرنے کی کوشش کی تو شاہ جی بولے۔

”دماغ پر زور مت ڈالو بھائی اشفاق احمد۔ لو سگریٹ پیو۔“

اشفاق نے معذرت پیش کرتے ہوئے کہا۔

”میں سگریٹ نہیں پیتا۔“

”اور کیا پیچ ہو؟ شراب؟“

شاہ جی نے اشفاق کی طرف ذرا سا جھک کر پوچھا۔ اشفاق اور زیادہ شراب گیا اور شراب پیتے ہوئے نفی میں سر ہلاتے لگا۔ شاہ جی ہنسے ہوئے پیچھے ہٹ گئے۔ پھر میری طرف دیکھا اور بولے۔

”بھائی! تمہارا یہ دوست مشتاق احمد بڑا مزے دار آدمی ہے۔“

میں نے کہا۔

”شاہ جی! اس کا نام مشتاق احمد نہیں اشفاق احمد ہے۔“

شاہ جی نے ہاتھ کو جھٹک کر کہا۔

”مجھے معلوم ہے یار۔ مجھے معلوم ہے، مجھ سے بحث نہ کرو۔“

اتنے میں اوپر سے وہی فوجوان جو خاموش رہتا تھا چائے لے کر آگیا۔

اس نے حسب معمول خاموشی سے کونے والی تپائی پر چائے کا ٹریے رکھا اور اٹنے پاؤں واپس چلا گیا۔ شاہ جی نے مجھے کہا۔

”ڈال دو پیالوں میں چائے۔ یاد ہے نا؟ مجھے چائے کی آدھی پیالی دینا۔“

ہم چائے پینے لگے۔ اشفاق احمد نے سوال کرنے شروع کر دیئے۔ شاہ جی اس کے ہر سوال کا جواب بڑے مدلل انداز میں یعنی دلیل کے ساتھ دیتے جاتے۔ جہاں اشفاق احمد کو کچھ اختلاف ہوتا اور وہ اس کا اظہار کرتا تو شاہ جی کہتے۔

”تم اختلاف کو اپنی جگہ پر قائم رکھو میں کب کہتا ہوں کہ اختلاف دور کرو؟ جو بات اچھی لگتی ہے اسے مان لو۔ جو اپیل نہیں کرتی اسے چھوڑ دو۔ ہاں آگے بولو۔“

اشفاق احمد بھی بولنا جانتا تھا۔ وہ خوب بولتا رہا۔ دیر تک دونوں میں تصوف کے مسائل پر باتیں ہوتی رہی۔ میں ان کی بحث بڑے غور سے سن رہا تھا۔ چائے کا دوسرا اور پھر تیسرا دور چلا۔ ہر بار شاہ جی اسی کڑک دار آواز میں نعرہ لگاتے۔

”اوپر والو! اور چائے بھیج دو۔“

اور وہ خاموش نوجوان چائے لے کر آجاتا جس کے بارے میں شاہ جی نے فرمایا تھا کہ میں اسے خاموش فلموں میں بے نگاہ کر لایا ہوں۔ ان کی بحث سے مجھے معلوم ہوا کہ یہ ساری باتیں اور سارے مسائل میں پہلے بھی امرتسر میں سن چکا ہو۔ میرے لئے ان میں کوئی نئی بات نہیں تھی۔ وہاں اگر مجھے کوئی بات اچھی اور نئی لگی تھی تو وہ شاہ جی کی شخصیت تھی۔ وہ بڑے دلچسپ آدمی تھے اور ان کا باتیں کرنے کا انداز بھی سب سے الگ تھلک تھا۔ مسئلے مسائل پر باتیں کرتے کرتے وہ اچانک رک جاتے اور کوئی ایسی بات کہہ دیتے جس کا زیر بحث موضوع سے کوئی تعلق نہیں ہوتا تھا مثلاً ایک بار وہ امام غزالی پر بڑی

مدلل باتیں کر رہے تھے کہ ایک دم خاموش ہو گئے۔ ناک کو دو تین بار اوپر چڑھا کر سوس سوس کیا اور کھلے میں کسی کو گھلی دے کر بولے۔

”اس نے پھر منی کے تیل والا چولہا جلایا ہے۔ مٹی کے تیل کی بو مجھے زہر لگتی ہے۔“

اس کے بعد وہ امام غزالی کو بھول گئے۔ کنگ شارک کا سرگٹ سگا کر بولے۔

”سنو! حمیس زمانہ جاہلیت کے ایک عرب شاعر کے شعر سناتا ہوں۔“

پھر پہلے انہوں نے عرب شاعر کے عربی اشعار سنائے پھر اس کا ترجمہ کرتے سنایا۔

”ان شاعروں پر ہمارے علاقے میں کوئی قابل قدر کام نہیں ہوا۔“ ہمیں وہاں بیٹھے کافی دیر ہو گئی تھی۔ اشفاق احمد بھی اٹھنے کے لئے پر تون رہا تھا۔ ہم اجازت لینے ہی والے تھے کہ شاہ جی نے پٹنگ کے پہلو میں رکھی بوسیدہ کتاب اٹھائی اور پٹنگ کے ساتھ ٹپک لگا کر اس کی ورق گردانی کرتے ہوئے بولے۔

”اچھا اچھا۔ اب تم لوگ جاؤ۔ پھر کبھی باتیں کریں گے۔“ ہم دروازہ بند کر کے گلی میں آئے تو ہمیں شاہ جی کی کڑک دار آواز سنائی دی۔ خاموش فلموں سے نکالے ہوئے نوجوان سے مخاطب ہو کر انہوں نے نعرہ لگایا تھا۔

”اوائے برتن اٹھا کر لے جاؤ۔“

میں نے گلی میں سے گزرتے ہوئے اشفاق سے پوچھا۔

”کیا خیال ہے تمہارا؟“

اشفاق بولا۔

”یار بڑا دلچسپ آدمی ہے۔ بہت لائق بھی ہے۔ یاد کیسے کیسے لوگ

شہر کی گھنوں میں گناہم پڑے ہیں۔ اب تم ان کا مقابلہ اپنے ترقی پسند اور رجعت پسند دانشوروں سے کرو۔ تمہیں زمین آسمان کا فرق لگے گا۔

میں نے کہا۔

”یہ تو ہے۔“

اشفاق کہنے لگا۔

”میں کبھی بھی شاہ جی کے پاس ضرور آیا کروں گا۔“

مجھے نہیں معلوم کہ اشفاق شاہ جی سے ملنے راکل پارک کبھی کبھار جاتا تھا یا نہیں لیکن میں جتنے میں ایک پھیرا شاہ جی کے ہاں ضرور لگا آتا تھا۔ اس کی دو وجوہات تھیں پہلی یہ کہ مجھے شاہ جی سے زمانہ جاہلیت کے عرب شاعروں کے شعر سننے کا شوق تھا اور دوسری اہم وجہ یہ تھی کہ اسی گلی میں مجھے ایک لڑکی سے محبت ہو چکی تھی۔ محبت کیا ہوئی تھی۔ نوجوانی کا زمانہ تھا۔ اس نے مجھے گلی میں سے گزرتے دیکھ کر وہ مسکرائی میں بھی مسکرا دیا۔ بس محبت ہو گئی۔ شاہ جی کے ہاں سے واپسی پر میں اس کے مکان میں چلا جاتا۔ اس نے مکان کی پچھلی گلی والا دروازہ کھلا رکھا ہوتا تھا۔ میں اس لڑکی کو ہفتے میں صرف ایک بار ہی مل سکتا تھا۔ اس روز اسے وہاں سے چھٹی ہوتی تھی جہاں وہ سلائی وغیرہ کا کام کرنے جاتی تھی۔ ہر حال یہ ایک الگ داستان محبت ہے۔ میں اس کا تذکرہ یہاں نہیں کروں گا۔“

اشفاق احمد ہفت روز ”لیل و نهار“ کا ایڈیٹر بن گیا۔ ”لیل و نهار“ پروگریسو پیپر کا رسالہ تھا اور اس کا دفتر امروز پاکستان ٹائمرز وانی عمارت یعنی بھارت بلڈنگ میں ہی تھا۔ یہ بلڈنگ اب صاف ہو چکی ہے۔ اس کی جگہ باڑہ مارکیٹ بن گئی ہے۔ جہاں سے اگر آپ چاہیں تو آپ کو اطالوی شوژ مل سکتے ہیں۔ اطالوی شوژ آپ کو شہر میں اور کسی جگہ نہیں ملیں گے۔ جس زمانے کی میں بات کر رہا ہوں تب بھارت بلڈنگ اپنی جگہ پر پوسیدہ حالت میں قائم

تھی۔ اس میں بجلی کے دفاتر بھی ہوتے تھے اور میں اپنے گوالہندی والے گھر کا بل جمع کروانے یا بل درست کروانے وہاں جایا کرتا تھا۔ پاکستان ٹائمرز اور امروز اخبار کے دفتر میں تو میرا تقریباً روز ہی پھیرا لگتا تھا۔ میرے سبھی ترقی پسند دوست امروز اور پاکستان ٹائمرز سے وابستہ تھے۔ ”لیل و نهار“ شائع ہونا شروع ہوا تو وہاں مزید دوست آگئے اور خوب محفلیں لگنے لگیں۔ جس زمانے میں میری ”آفاق“ اخبار میں رات کی ڈیوٹی ہوتی تھی تو میں رات کے ایک ڈیڑھ بجے ڈیوٹی سے فارغ ہو کر ”امروز“ اخبار کے دفتر کا پتھر لگا کر اپنے گوالہندی والے گھر جاتا تھا۔

مجھے یاد ہے گرمیوں کی راتوں کو امروز کا رات کی شفٹ والا عملہ باہر کھلی چھت پر بیٹھا کام کر رہا ہوتا تھا۔ اوپر رسی کے ساتھ بلب روشن ہوتے تھے۔ حیدر ہاشمی شفٹ انچارج ہوتا تھا۔ میں تھوڑی دیر وہاں بیٹھ جاتا۔ حیدر ہاشمی مجھ سے ضرور پوچھتا کہ ”آفاق“ نے آج کیا ہینہ لائن لگائی ہے۔

امروز کے دفتر میں جہاں ایڈیٹر کا کمرہ تھا وہاں سے اس بلڈنگ کی چیمبر لین روڈ والی ایک بنگ سی کھلی نظر آیا کرتی تھی۔ یہ کھلی آگے جا کر بند ہو جاتی۔ اس میں شروع شروع میں ہمیں ایک مکان الاٹ ہوا تھا۔ الاٹ کہاں ہوا تھا بس ہم نے قبضہ کر لیا تھا۔ میں اور میرا ایک گوالہندی کا دوست اس مکان کی دوسری منزل پر پہلی بار گئے تو مکان تقریباً لوٹا جا چکا تھا۔ ایک الماری پر ابھی تک کالا لگا تھا۔ ہم نے کالا توڑا اور اندر اسٹوں کی کتابیں، کاپیاں اور ایک چھوٹی سی بنگلوں کی نوکری پڑی تھی۔ میں نے نوکری باہر نکالی۔ نوکری میں ملے کا ایک آدھا کڑھا ہوا رومال تھا۔ ڈی ایم سی کے ریکارڈر دھانگوں کی تین چار گچھیاں، ایک لیڈی رسٹ وایج اور پانچ روپے کا نوٹ بھی تھا۔ لیڈی رسٹ وایج میرے دوست نے رکھ لی اور میں نے پانچ روپے کا نوٹ رکھ لیا۔ اس وقت مجھے خیال آیا تھا کہ یہ کڑھائی ضرور کوئی ہندویہ کھ لڑکی کرتی ہوگی۔ یہ رسٹ وایج اور پانچ روپے کا نوٹ بھی اسی کا ہوگا۔ خدا جانے اسے اپنے گھر

والوں کے ساتھ کن حالات میں وہاں سے بھاگنا پڑا۔ خدا جانے وہ زعمہ کئی ہوئی یا راستے میں اغواء ہو گئی ہوگی؟ اس قسم کے خیالات میرے ذہن میں آتے رہتے تھے مگر مجھے پانچ روپے کے نوٹ کی بڑی خوشی تھی۔ میں نے گوالمنڈی میں جا کر اسی وقت گئے کھائے تھے۔

اس بلڈنگ میں ”لیل و نمار“ کے دفتری کھڑکیاں میو ہسپتال کی طرف کھلی تھیں۔ ”لیل و نمار“ کا دفتر پہلے پہل ٹکسن روڈ پر انور کارنوسٹ والی بلڈنگ میں ہوتا تھا۔ پہلے فیض صاحب اس کے ایڈیٹر تھے۔ پھر سید سبط حسن اس کے ایڈیٹر ہو گئے۔ پچھلے پچھلے وہ تھے کہ پہلے سبط صاحب تھے۔ سمر حسان سبط حسن کے زمانے میں ”لیل و نمار“ بڑے کمال کا رسالہ ہوتا تھا اور اس نے کافی مقبولیت حاصل کی تھی۔ اشفاق احمد نے آکر ظاہر ہے اس پر اپنی چھاپ لگائی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ رسالہ ”لیل و نمار“ چوں چوں کا مرید بن گیا۔ اسے پڑھتے ہوئے کبھی لگتا کہ یہ لیل و نمار ہے۔ کبھی لگتا کہ نہیں یہ لیل و نمار نہیں ہے۔ یہ ”داستان گو“ ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ادب میں سبط حسن اور فیض صاحب کا اپنا ایک نظریہ تھا جبکہ اشفاق احمد کا کوئی طے شدہ نظریہ نہیں تھا۔ مجھے نہ توسط حسن والے نظریے سے کوئی دلچسپی تھی اور نہ اشفاق احمد کے کوئی نظریہ نہ ہونے سے کوئی سروکار تھا۔ مجھے صرف اشفاق احمد سے دلچسپی تھی۔ مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ میرا یار ”لیل و نمار“ میں آگیا ہے۔

ادھر ادھر سے پھرتا پھرتا میں ”لیل و نمار“ کے دفتر میں آجاتا اور اشفاق کے پاس بیٹھ جاتا۔ ہم خوب باتیں کرتے۔ پھر اس کے کمرے سے اٹھ کر آرٹس زیدی کے پاس چلا آتا۔ زیدی بڑا اچھا آرٹسٹ تھا اور آدمی بھی بہت کمال کا تھا۔ اس کی خاموش گفتگو میں بڑی گرمی اور محبت تھی۔ اس کی لائن میں زبردست ایکپریشن ہوتا تھا۔ اس کے بنائے ہوئے کارٹون لیل و نمار کی جان ہوتے تھے۔

پھر خدا جانے سیاست نے کیا رنگ بدلا کہ اشفاق کی جگہ صوفی جمہور دمنار“ کے ایڈیٹر بن گئے۔ دمنار سسی سر صوفی صاحب نے پوری کردی ”لیل و نمار“ ایک گمنام سا پرنسپل بن کر رہ گیا۔ صوفی صاحب کے دفتری جج زبانی تھی۔ وہ اپنا حقہ ساتھ لاتے تھے۔ ان کی چلم ان کے گھر سے بھر کر جاتی تھی۔ ایک خاص ملازم ہوتا تھا اس کا نام بھول گیا ہوں۔ وہ دمنار کی اسی چلم لے کر سائیکل پر سوار ہو کر صوفی صاحب کے گھر میں آباد پہنچتا۔ چلم میں خاص اہتمام کے ساتھ تمباکو بھرا جاتا۔ اس کے اوپر کپاس کے بندوں کی آگ جلائی جاتی اور ملازم سائیکل پر بیٹھ کر جب چلم ہاتھ میں لے لیل و نمار کے دفتر میں داخل آ رہا ہوتا تو چلم میں سے دھواں اٹھ رہا اور یوں لگتا جیسے کوئی اٹھلیٹ الپک گیمز کی شمع لے کر چلا آ رہا ہے۔ اس حسن نے ”لیل و نمار“ کو جس مقام تک پہنچایا تھا یہ رسالہ پھر وہاں تک نہ پہنچا اس مقام سے نیچے ہی نیچے گر گیا اور آخر ایک روز بند کر دیا گیا۔

اب ہم ریڈیو سٹیشن کی نئی عمارت میں آ گئے تھے۔ یہ عمارت ایمپریس ڈس کے شملہ پناؤی والے کوٹے کے شروع میں واقع ہے۔ ایک مدت تک رت زیر تعمیر رہی۔ عمارت بن کر تیار ہو گئی۔ اس میں ساز و سامان بھی لگا دیا۔ ہمارے ریڈیو کے عملے کو منتقل نہیں کیا جا رہا تھا۔ جن لوگوں نے عمارت بنائی وہ وہاں اپنی فیملی کے ساتھ مزے سے رہ رہے تھے۔ ان ہی دنوں دن کچھ پاپاک بھارت جھڑپیں شروع ہو گئیں۔ میوزک ڈائریکٹر شریار نے نور جہاں آواز میں مشہور ملی ترانہ پڑانے ریڈیو سٹیشن کی بجائے نئے ریڈیو سٹیشن، سنوڈیو میں جا کر ریکارڈ کر دیا۔ یہ ملی نغمہ تھا۔

اے - وطن کے چیلے ہو انو!

میرے نغمے تمہارے لئے ہیں

نغمہ نگار قاتل شفا کی تھا مگر نام جمیل الدین عالی کا لکھا گیا۔ اس کی بھی یہ وجہ تھی جس کا ذکر کرنا میں یہاں مناسب نہیں سمجھتا۔ اتنا ضرور کہوں گا

کہ جمیل الدین عالی کا اس میں کوئی قصور نہیں تھا۔

خدا خدا کر کے ہم لوگ پرانے ریڈیو کی بوسیدہ عمارت کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہہ کر نئی عمارت میں منتقل ہو گئے۔ یہاں آنے کے تھوڑے ہی دنوں بعد سن پندرہ کی پاک بھارت جنگ شروع ہو گئی۔ اشفاق احمد اب ہاضبہ طور پر ریڈیو پاکستان لاہور سے منسلک نہیں تھا۔ مگر ریڈیو کے لئے مسلسل لکھتا رہتا تھا۔ اس زمانے میں اس نے ایسے ایسے ریڈیو ڈرامے اور فچر لکھے جو یادگار رہیں گے۔ اس کا مقبول عام فچر ”تلقین شاہ“ چل رہا تھا اور ترقی کی منازل طے کرتا چلا جا رہا تھا۔ جنگ شروع ہوئی تو تلقین شاہ فچر اپنے نقطہ عروج پر پہنچ گیا۔ ریڈیو پاکستان لاہور نے بھی پاکستان بھارت جنگ میں اپنا قومی کردار دوسرے اداروں کی طرح بڑی کامیابی سے نبھایا۔ شہر کا کوئی ادیب اور شاعر ایسا نہیں تھا جس نے ریڈیو کو اپنی بلا معاوضہ خدمات نہ پیش کی ہوں۔

اشفاق احمد تلقین شاہ کے ساتھ دوسرے فچر بھی لکھتا۔ تقریریں بھی کرتا اور اپنے دوسرے ساتھی ادیب اور شاعروں کے ساتھ قوم کے جذبول کو بلند رکھنے کے لئے اپنا ملی فرض ادا کرتا رہا۔ میں اب ریڈیو کے ساتھ باقاعدہ طور پر منسلک ہو گیا ہوا تھا اور سارا دن بلکہ رات گئے تک ریڈیو سٹیشن پر ہی رہتا۔ کوئی فچر لکھتا ہوتا تو فچر لکھتا۔ چھوٹی سی تقریر لکھنی ہوتی تو وہ بھی لکھتا۔ جنگ ختم ہو گئی۔ قوم اس آزمائش میں سے سرخ رو ہو کر نکلی۔ قوم کو ایک نیا جذبہ ایک نئی طاقت ملی۔ ریڈیو کے پروگراموں کو نئے تقاضوں کی روشنی میں ترتیب دیا گیا لیکن جیسا کہ قوموں کی تاریخ میں اکثر ہوتا آیا ہے کچھ عرصہ گزر جانے کے بعد ریڈیو کے پروگرام پھر پرانی ڈگر پر واپس آ گئے۔ اس کے باوجود اشفاق احمد، میرزا ادیب، ناصر کاظمی اور صفی مجسم ایسے انہوں اور شاعروں نے ریڈیو کے معیار کو کافی حد تک بلند کئے رکھا۔

اشفاق کے ساتھ میرا نئے ریڈیو سٹیشن والا زمانہ بھی بڑا یادگار زمانہ تھا۔ اگرچہ وہ ریڈیو سٹیشن روز نہیں آتا تھا مگر ہفتے میں دو بار اس کا پھیرا ضرور

ہوتا اور ہم کافی وقت ایک دوسرے کے ساتھ گزارتے۔ کبھی کمرے میں جاتے۔ کبھی ریڈیو کی کنکین میں بیٹھ کر چائے پیتے اور کبھی سنوڈیو کے اندر ہی بیٹھے دیر تک باتیں کرتے۔ اسی دوران ٹیلی ویژن سٹیشن قائم ہو گیا۔ یہاں اشفاق احمد کے مزید جوہر کھلے۔ اس نے اور بانو قدسیہ نے مل کر ٹیلی ویژن کے لئے لکھنا شروع کر دیا۔ مل کر لکھنے سے میری مراد یہ نہیں ہے کہ دونوں ایک پلے مل کر لکھتے تھے۔ بلکہ مطلب یہ تھا کہ دونوں الگ الگ ڈرامے اور سیریل وغیرہ لکھتے تھے۔ اشفاق نے ٹیلی ویژن پر ریڈیو کے اپنے فچر ”ٹاپلی دے تھلے“ کو پھر سے شروع کر دیا۔ جسے لوگوں نے پسند کیا۔ پھر اس نے ایک محبت سو افسانے کے نام سے ڈراموں کا سلسلہ لکھا۔ یہ ڈرامے وہ اپنی مرضی سے بغیر کسی کا خیال کئے لکھتا۔ لوگوں کو بعض اختانات بھی پیدا ہوئے۔ بعض نے کہا کہ ڈراموں میں کردار بڑے لمبے لمبے ڈیلاگ بولتے ہیں۔ مگر مجموعی طور پر یہ سلسلہ بھی بہت پسند کیا گیا۔

اب میں تھوڑا اور پیچھے کی طرف جاتا ہوں۔

اشفاق نے ماؤں ٹاؤن میں زمین لے کر اپنا مکان بنانا شروع کیا۔ جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں۔ اس نے مجھے وہ پلاٹ دکھایا۔ یہ پلاٹ C بلاک میں تھا اور ماڈل ٹاؤن میں داخل ہوتے ہی دائیں ہاتھ کو تھا۔ اس وقت تو وہاں بڑی ہی پرسکون فضا تھی۔ اب اس فضا کے سکون میں رکشوں وغیرہ نے تھوڑا جھلن ڈالا ہے۔ پھر بھی شہر والا حال نہیں ہے۔ میں نے اشفاق سے کہا کہ پلاٹ کے درمیان میں ایک درخت ضرور لگائے۔ اس نے اپنی پسند کے نرم بانس بھی لگوائے جو اب کافی بڑے ہو گئے ہیں۔ اس کو بھی کاغذ اس نے خود تیار کیا تھا۔ یعنی وہ جس طرح کا مکان یا مکانیت چاہتا تھا اس نے اسی طرح کی کوٹھی بنوائی۔ ڈرائینگ روم لمبا اور کافی کشادہ ہے۔ سامنے والی ساری کی ساری دیوار میں مونے شیشے لگے ہیں جس سے روشنی خوب آتی ہے اور شور بھی باہر ہی رہتا ہے۔

اس سے بھی پہلے کی بات ہے کہ لاہور میں ایک نوجوان کے ہاتھوں لڑائی جھگڑے میں دوسرا آدمی شدید زخمی ہو گیا اور ہسپتال میں جا کر فوت ہو گیا۔ اس نوجوان پر مقدمہ چلا اور اسے پھانسی کی سزا سنائی گئی۔ باپ نے اپیل کی۔ ہائی کورٹ اور اس کے بعد سپریم کورٹ نے بھی سزا بحال رکھی۔ پوڑھا باپ انگلیاں آنکھوں کے ساتھ اشفاق احمد کے پاس آیا اور کہنے لگا۔

”میرا ایک ہی بیٹا ہے۔ اس نے جان بوجھ کر کسی کو نہیں مارا۔ بس لڑائی ہوئی اور مخالف کا خون ہو گیا۔ اب اس کی رحم کی اپیل صدر ایوب کے پاس گئی ہوئی ہے۔ اگر اسے پھانسی ہو گئی تو اس کے ساتھ میں بھی مر جائوں گا۔ اس کی بہنیں اور ماں بھی مر جائیں گی۔ ہمارا سارا گھر مر جائے گا۔ میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں۔ میرے بچے کو بچا لیجئے۔“

اشفاق احمد نے کہا۔

”محترم! مجھے آپ کے ساتھ پوری ہمدردی ہے مگر میں اس سلسلے میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟“

اس وقت تک اشفاق احمد کہتا ہے کہ میرا خیال اپنے اس دوست کی طرف نہیں گیا تھا جو ان دنوں صدر ایوب کا ایک طرح سے پی آر او ہوتا تھا۔ بد نصیب لڑکے کا غم زدہ باپ یہ سارا کچھ معلوم کر کے اشفاق کے پاس پہنچا تھا۔ چنانچہ جب اس نے پی آر او کا نام لے کر کہا کہ آپ انہیں کہیں کہ اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے صدر ایوب سے میرے بچے کی رحم کی اپیل منظور کراویں۔ تب اشفاق احمد ساری بات سمجھ گیا۔ لیکن اس نے لڑکے کے باپ کو زیادہ تسلی نہ دی کیونکہ وہ ایسا کرنے کی پوزیشن میں بھی نہیں تھا۔ اس نے صرف اتنا کہا۔

”محترم! میں انہیں فون کر کے ضرور معلوم کروں گا کہ وہ اس سلسلے میں کیا مدد کر سکتے ہیں؟“

بد نصیب لڑکے کا باپ رونے لگا۔ اس کی ہنگامی بندھ گئی۔ اشفاق خود تب اولاد تھا۔ اس کا دل دہل گیا۔ اس نے فوراً کراچی جانے کا فیصلہ کر لیا۔ لڑکے کے باپ کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

”ہو گا تو سب کچھ وہی جو خدا کو منظور ہو گا۔ مگر میں ایک بار کوشش ضرور کر کے دیکھتا ہوں۔ اگر بچے کی زندگی باقی ہے تو وہ انشاء اللہ ضرور بچ جائے گا۔“

لڑکے کے باپ کی جان میں جان آگئی۔ کیونکہ کسی نے اس سے کہا تھا۔ اگر اشفاق حامی بھر لے گا تو پھر آپ کا کام ہو جائے گا۔ اشفاق احمد نے حامی بھری اور شام کو میرے پاس آ کر مجھے سارا قصہ پایا اور کہا۔

”تم بھی میرے ساتھ چلو۔“

میں اسی وقت تیار ہو گیا۔ شاہینار ایکسپریس ان دنوں نئی نئی چلی تھی۔ ہم نے اس ٹرین میں دو سیٹیں بک کرائیں اور کراچی روانہ ہو گئے۔ اشفاق نے اپنے دوست کو کراچی میں ٹیلی فون کر دیا تھا کہ وہ ایک انتہائی ضروری اور ذاتی مسئلے پر بات کرنے آ رہا ہے۔ وہ میرا بھی دوست تھا۔ میں اس کا فرضی نام شہباز لکھ دیتا ہوں۔

ہم کراچی پہنچنے کے بعد ٹیکسی میں بیٹھ کر سیدھے شہباز کی کوشی پر آ گئے۔ وہ ہمارا منتظر تھا۔ ہمیں دیکھ کر بڑا خوش ہوا۔ فوراً اشفاق سے پوچھنے لگا۔

”بات کیا ہے؟ خیر تو ہے۔ تم بونٹی آنے والے نہیں ہو۔“

اشفاق نے کہا۔

”ذرا سانس تو لینے دو۔ ساری بات بتاتا ہوں۔“

شام ہو رہی تھی۔ ہم کوشی کے ٹیریس میں بیٹھ گئے۔ کراچی کی شام کی ہوا چل رہی تھی۔ یہ ہوا میری کبھی محبوبہ رہ چکی ہے۔ یہ ہوا ہی مجھے لاہور

سب کچھ سن چسنے کے بعد شہباز بولا۔

”اگر اس لڑکے کی رحم کی اپیل صدر کے پاس آئی ہوگی ہے تو میں سب سے پہلے اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس کے دیکھے اور فائیل کو پڑھے بغیر میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔“

دوسرے روز دفتر جانے کے بعد شہباز نے رحم کی اپیل والی فائیل کا پورا مطالعہ کیا۔ دوپہر کے بعد کوٹھی پر واپس آیا تو کہنے لگا۔

”اشفاق یار! اس میں تو قانونی طور پر کوئی بھی نقطہ اس لڑکے کے حق میں نہیں جاتا یہ فائیل صدر کے سامنے گئی تو ذرا رحم کی اپیل مسترد کر دے گا۔ کیونکہ دوسری وزارتوں کی رائے پڑھ کر ہی صدر نے کوئی فیصلہ کرنا ہوتا ہے اور متعلقہ وزارتوں کے سیکرٹریوں نے لڑکے کے خلاف ہی لکھا ہے بلکہ سفارش کی ہے کہ اس کی رحم کی اپیل منظور نہ کی جائے۔“

اشفاق احمد پریشان ہو گیا۔ میں بھی پریشان ہو گیا۔ میری آنکھوں کے سامنے لڑکے کے باپ کا غم زدہ اکتبا چہرہ آگیا۔ اشفاق احمد کہنے لگا۔

”اگر ایسی ویسی بات ہو گئی تو اس کا باپ ماں ہمیں سب مرجائیں گی۔“

شہباز نے کہا۔

”اس نے بھی تو بڑا ظلم کیا ہے۔ ایک انسان کی جان لی ہے۔“

اشفاق بولا۔

”پس یار جو ہوتا تھا ہو گیا ہے۔ اب اگر کوئی صورت ہو سکتی ہے تو

کچھ کرو۔ میرا مطلب ہے اسے پھانسی نہ ہو عمر قید ہو جائے۔ یہ

بھی ایک طرح کافی سخت سزا ہوتی ہے۔ ساری جوانی جیل میں قید

ہو جائے گی اس کی۔“

شہباز سوچنے لگا۔ پھر بولا۔

سے کراچی کھینچ کر لے جایا کرتی تھی۔ میں ان دنوں کراچی جا رہا تھا اور اسی ہوا سے ملاقات کرنے کے بہانے تلاش کیا کرتا تھا۔ ارا سا کام نکلا تو میں فوراً کراچی روانہ ہو جاتا۔ سارا دن کسی جگہ بیٹھا شام ہونے کا انتظار کرتا رہتا۔ جیسے ہی شام ہوتی اور سمندر کی طرف سے آنے والی میری محبوبہ ہوا مجھ سے ملنے نکلتی تو میں بھی اپنی کہیں جگہ سے نکل آتا۔ سیدھا پیام گرو میں یا کسی دوسری جگہ بیٹھ کر بیٹریچا اور پھر اپنی محبوبہ کراچی کی شام کی ہوا کی باتیں میں بانٹنے والے سڑک پر نکل آتا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے گلے ملنے۔ ایک دوسرے کا حال پوچھتے۔ وہ مجھے دور سمندر پار رہنے والے لوگوں، ان کے شہروں، ان شہروں کے ملکوں، ان ملکوں کے جنگلوں، وہاں کے گرجا گھروں، گرجا گھروں کے پر سکون خوبصورت قبرستانوں، وہاں کے سے خانوں اور ان سے خانوں میں رقص کرنے والیوں کی باتیں بتاتی اور ہم اپنے راز و نیاز میں مصروف سڑک پر نہ جانے کہاں سے کہاں نکل جاتے۔

اس وقت بھی جب میں اور اشفاق اپنے مشترکہ دوست شہباز کی کوٹھی کے ٹیریس پر بیٹھے تھے تو شام کی ہوا چل پڑی۔ ہوائے مجھے دیکھ لیا تھا۔ وہ سمندر کے اوپر سے ہوتی ہوئی سیدھی میرے پاس آئی اور میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے وہاں سے اٹھ چلنے کو کہا۔

میں خود اس کے ساتھ جانے کو بے تاب ہو گیا تھا۔ مگر میری مجبوری تھی۔ وہاں سے مل نہیں سکتا تھا۔ میں نے اسے اپنی مجبوری بتائی چاہی تو شام کی ہوائے کہا۔

”میں سب جانتی ہوں۔ تم بیس ٹھہرو۔ میں جاتی ہوں۔“

اور وہ آئیں بحرئی مسکراتی میرا ہاتھ چھوڑ کر چلی گئی۔ اس وقت شہباز

اشفاق احمد سے پوچھ رہا تھا۔

”اب کھل کر بات کرو۔ کیا معاملہ ہے؟“

اشفاق احمد نے شروع سے آخر تک سارا معاملہ اس کے گوش گزار کیا۔

”میں صرف اتنا کر سکتا ہوں کہ یہ فائیل صدر کے آگے پیش نہ
کوں۔“

اشفاق نے پوچھا۔

”تم کب تک اسے اپنے پاس رکھو گے؟ ایک نہ ایک دن تو ہمیں
یہ فائیل پیش کرنی ہی پڑے گی۔ آخر پھانسی کے گیس کی فائل
ہے۔“

شہباز کہنے لگا۔

”تم ٹھیک کہتے ہو۔ اس فائل کے بارے میں حکم ہے کہ جتنی
جلدی ہو سکے اسے آگے دوسرے متعلقہ افسر تک پہنچایا جائے۔ پھر
بھی میں تمہاری خاطر کوشش کروں گا کہ اسے جتنی دیر تک غائب
کر سکوں غائب کر دوں۔ جب پیچھے سے بت ہی دباؤ پڑے گا تو پھر
مجبوراً نکال کر پیش کر دوں گا۔ آگے جو لڑکے کی قسمت۔ اگر اس
کی زندگی ابھی باقی ہے تو اس کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔“

اشفاق نے کہا۔

”چلو۔ یہی غیبت ہے۔ تم فی الحال فائیل اپنے پاس ہی رکھو۔“
شہباز فوراً بولا۔

”اپنے پاس نہیں رکھ سکوں گا بھائی میں تو اسے کسی الماری میں بند
کر دوں گا لیکن یہ ضرور بتائے دیتا ہوں اور تم لڑکے کے والد کو بھی
بتا دیتا کہ اگر پیچھے سے زور پڑا اور پیچھے سے زور ضرور پڑے گا تو
پھر مجھے فائیل نکال کر پیش کرنی ہی پڑے گی۔ میں اسے کچھ عرصے
کے لئے غائب تو کر سکتا ہوں مگر اسے ضائع نہیں کر سکتا۔“

”ہاں بھئی! یہ تو بالکل ناممکن ہے۔“

اشفاق نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ یہی بات بہت تھی۔ ورنہ
کوئی اتنی خطرناک ذمہ داری لیتا ہے۔ صرف اشفاق کے کہنے پر شہباز اس

خطرناک کام کے لئے تیار ہو گیا تھا اور اشفاق محض ایک غم زدہ باپ اور اس
کی اولاد سے محبت کی خاطر یہ سب کچھ کر رہا تھا۔

ہم دو راتیں کراچی میں گزارنے کے بعد لاہور واپس آگئے۔ لڑکے کا
باپ بے چینی سے امید و بیم کے عالم میں ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ وہ اشفاق کے
مکان پر بیٹھا تھا۔ میں بھی وہیں تھا۔ اشفاق احمد نے بڑی دانشمندی کے ساتھ
آہستہ آہستہ اسے ساری بات بیان کر دی۔ لڑکے کے باپ نے ٹھنڈی آہ بھری
اور بولا۔

”خدا آپ کے بچوں کو سلامت رکھے۔ میرے لئے اتنی تسلی ہی

بست ہے۔ آپ نے اس کام میں ہاتھ ڈالا ہے۔ میرے اللہ نے جاپا
تو میرا بیٹا ضرور بچ جائے گا۔“

وقت گزرنے لگا۔ لڑکے کا باپ دوسرے تیسرے روز اشفاق کے پاس آ
کر پہنچ کر جاتا۔ وہ سکرپٹ بھی جاتا۔ یہ معلوم کرنے کے کہ کہیں کراچی سے
فائیل واپس تو نہیں آگئی۔ مگر فائیل تو شہباز نے الماری میں بند کر کے رکھ دی
تھی۔ بس اللہ توکل ہی رکھ دی تھی کہ اگر پیچھے سے زور پڑا تو جتنی دیر تک
ٹال سکا حملے کی پلغار کو ٹالوں گا۔ جب بے بس ہو گیا تو فائیل پیش کر دوں گا۔

حیرانی کی بات ہے کہ جو فائیل چار پانچ دن سے زیادہ صدر کے
میکرٹ میں نہیں ٹھہر سکتی اسے وہاں رکے چھ مہینے گزر گئے۔ شہباز نے بعد
میں بتایا کہ پیچھے سے ریٹائرمنٹ آتے تھے اور میں انہیں گول کر جاتا تھا۔ وہ کہتا
ہے کہ میں اس ریٹائرمنٹ کے انتظار میں تھا جسے میں گول نہیں کر سکتا تھا۔

ایک دن کی بات ہے کہ لڑکے نے جو پھانسی کی کوٹھڑی میں تھا اپنے
باپ کو پیغام بھجوایا کہ پھانسی دینے والی کوٹھڑی کی صفائی ہو رہی ہے۔ مجھے ڈر
لگتا ہے کہ صبح مجھے ہی پھانسی دی جا رہی ہے۔ پریشان حال باپ اسی وقت روتا
ہوا اشفاق کے مکان پر آگیا اور ساری بات روتے ہوئے بیان کی۔ اشفاق نے
اسی لمحے کراچی اپنے دوست کو فون کیا اور پوچھا کہ وہ چیز جو میں تمہارے پاس

امانت کے طور پر چھوڑ آیا تھا وہ تم نے آگے پیش کر دی ہے کہ نہیں؟

دوسری طرف سے شہباز نے جواب دیا۔

”تمہاری امانت میری الماری میں بند پڑی ہے۔“

اشفاق نے لڑکے کے باپ کو بتایا تو باپ نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

”خدا کے لئے اپنے دوست سے کہیں کہ وہ الماری کھول کر دیکھ

آئے۔ میری تسلی ہو جائے گی۔“

اشفاق نے شہباز سے کہا۔

”یار الماری کھول کر دیکھ آؤ کہ میری امانت تمہاری الماری میں ہی

ہے۔“

شہباز بولا۔

”ٹھیک ہے۔ تم ہلڈ کرو۔ میں ابھی دیکھ کر آتا ہوں۔“

اشفاق نے لڑکے کے باپ سے کہا۔

”وہ الماری کھول کر فائل دیکھنے گیا ہے۔“

تھوڑی دیر بعد اشفاق نے پیلو پیلو کیا تو دوسری طرف سے شہباز کی

آواز آئی۔

”میں دیکھ آیا ہوں یار۔ فائل اسی طرح الماری میں بند پڑی ہے۔

مگر اب اس کا کچھ پتہ نہیں ہے۔ رہائندہ پر رہائندہ آرہے

ہیں۔ لگتا ہے یہ فائل مجھے اب صدر کو پیش کرنی ہی پڑے گی۔“

اشفاق نے کہا۔

”جب تک رکھ سکتے ہو اپنے پاس ہی رکھو۔ آگے اللہ مالک ہے۔“

اشفاق نے فون بند کر دیا۔ لڑکے کا باپ اشفاق کا ہاتھ اپنی آنکھوں کے

ساتھ لگا کر چٹکیاں بھر کر روئے لگا۔



اب ایسا اتفاق ہوا کہ یوم پاکستان آیا۔

لڑکے کی زندگی اللہ میاں نے لکھ رکھی تھی۔ شہباز نے اس کی رحم کی

پل کے ساتھ ایک نوٹ لکھا جس میں اس بات پر زور دیا کہ لڑکا ماں باپ کا

کلوتا فرزند ہے۔ اپیل صدر کے پاس پیش ہوئی۔ صدر نے سوت کی سزا عمر قید

میں تبدیل کر دی۔ باپ کو علم ہوا تو وہ سجدے میں گر گیا۔ دوڑا دوڑا اشفاق

کے گھر آیا اور رو کر اس کا شکریہ ادا کرنے لگا۔

اشفاق احمد کا دل اولاد کی محبت کے جذبے سے لہریں ہے۔ وہ دوسروں

کی اولاد سے بھی محبت کرتا ہے اور ان کے لئے اللہ تعالیٰ کے حضور ہمیشہ خیر کی

دعا مانگتا ہے۔

صدر ایوب کی جانب سے مغربی پاکستان کے بعد مشرقی پاکستان میں بھی

جمہوریت ترین چلائی گئی جس میں مشرقی پاکستان کے علاوہ مغربی پاکستان کے

دانشوروں، ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں کو شرکت کی دعوت دی گئی۔ اس کا

مرکزی خیال قدرت اللہ شہاب کی فکر کا نتیجہ تھا جو ان دنوں صدر ایوب کے

سیکرٹری تھے۔ پاکستان کے کوئے کوئے میں رہنے والے ادیبوں، شاعروں،

دانشوروں کو دعوت نامے بھیجے گئے۔ میں بھی ابن انشاء اور حفیظ جالندھری کے

ساتھ ڈھاکہ پہنچ گیا۔ وہاں اشفاق احمد پہلے سے موجود تھے۔ کیونکہ ٹرین کے سفر

کے بعد ڈھاکہ میں ادیبوں، دانشوروں کی ایک آل پاکستان کانفرنس بھی ہونے

والی تھی جس کے انتظام و انصرام کی خاطر اشفاق احمد کچھ روز پہلے وہاں پہنچ گیا

تھا۔

ہمیں ایم پی اے ہوش میں ٹھہرایا گیا۔ اشفاق احمد وہاں چیف سیکرٹری کے بنگلے میں ٹھہرا ہوا تھا۔ ہماری روزانہ ہی ملاقاتیں ہوتیں۔ دو روز بعد جمہوری ٹرین کا سفر شروع ہو گیا۔ یہ سفر ڈھاکہ کے کلا پور ریلوے اسٹیشن سے شروع ہوا۔ اس ٹرین نے سارے مشرقی پاکستان میں جہاں جہاں ریلوے لائن گئی ہوئی تھی سفر کرنا تھا۔ ہمیں تین چار دن لگ گئے۔ راستے میں جہاں دریا آ جاتا وہاں سے ہم سینہروں میں بیٹھ کر سفر کرتے۔ ہم کاکس بازار بھی گئے۔ وہاں لہراتے ناریلوں والے گرم سمندری ساحل پر بھی لمبی سیریں کیں۔ میرے لئے پرانی یادوں کی تجدید کا زمانہ تھا۔ مجھے لٹکا کا سمندری ساحل اور ٹکلتے میں دریائے جہلی کے کنارے مرطوب ہواؤں میں لہراتے ناریلوں کے درخت یاد آ رہے تھے۔ اشفاق احمد میرے ساتھ تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ مجھے خدا نے شاید صرف ناریل کے درختوں، جنوبی سمندروں کی موسلا دھار بارشوں اور گھنے گرم جنگلوں میں بھیتے پانس اور کیلے کے درختوں سے محبت کرنے کے لئے ہی پیدا کیا ہے۔ کیونکہ جب بھی میں بالکل نیوٹل ہو کر اپنے دل کو ٹھونکا ہوں تو اس میں جنوب مشرقی سمندروں کی مرطوب ہواؤں، ان ہواؤں میں لہراتے ناریل اور کیلے کے درختوں، پانس کے جھنڈوں میں برستی بارش، پونٹھوہار کے دھریک کے کانسی پھولوں، ایمن آباد کے مونجے کے پھولوں اور شمال مار بارغ کے آم کے درختوں اور لاہور کی نیم تاریکی گلی کوچوں اور سکول کو جاتی معصوم بچیوں اور لٹکا کی چائے اور اعلیٰ ترین سگریٹ کی محبت کے سوا مجھے کسی دوسری چیز کی اتنی محبت نظر نہیں آتی۔ اگر نظر آتی بھی ہے تو وہ مٹ جانے والی محبت ہوتی ہے۔ ہاتھ میں آکر ہاتھ سے نکل جانے والی محبت ہوتی ہے۔ چنانچہ کاکس بازار کے سمندری ساحل پر جب میں اشفاق احمد کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا تو میں ایک بالکل ہی مختلف آدمی تھا۔ اگر اس وقت اشفاق میرا سمندروں، جنگلوں، بارشوں، سیلون کی چائے اور قدیم قلعوں کے پرانے باغوں سے محبت کرنے والا چہرہ دیکھ سکتا تو وہ بھی سمجھتا کہ اس کے ساتھ اے

حمید کی بجائے کوئی دوسرا شخص چل رہا ہے لیکن وہ میرا یہ چہرہ نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میرا یہ چہرہ صرف لاہور کے درخت اور رات کو آسمان پر چمکنے والے ستارے اور اعلیٰ ترین سگریٹ ہی دیکھ سکتے ہیں۔ یا جب کبھی میں پونٹھوہار کے خوشبودار جیلے کھیتوں میں سے گذر رہا ہوتا ہوں اور بارش شروع ہو جاتی ہے اور بارش مجھے اپنا آئینہ دکھاتی ہے تو وہ اس آئینے میں میرا چہرہ دیکھ لیتی ہے اور بڑی خوش ہوتی ہے اور مجھ سے باتیں کرتی ہے۔

بارش میری محبوبہ ہے۔ ہم دونوں بادلوں کی چھاؤں میں جنگلوں، کھیتوں، پہاڑوں اور درختوں کے جھنڈوں میں چھپ چھپ کر ملتے ہیں۔ وہ میری زبان میں مجھ سے باتیں کرتی ہے۔ میں اس کی زبان میں اس سے باتیں کرتا ہوں۔

کاکس بازار کا سمندری ساحل بڑا لمبا ہے۔ ایک جانب ناریل کے درختوں کے جھنڈ دور تک چلے گئے ہیں دوسری جانب گہرا سبز سمندر حد نگاہ تک پھیلا ہوا ہے۔ اس سمندر میں میں سفر کر چکا ہوں۔ چار دن کا سفر تھا۔ آگے جا کر یہ سمندر گہرا سیاہ ہو جاتا ہے۔ اسی لئے اس کا نام کالا پانی پڑ گیا ہے۔ ہم دور تک نکل گئے تھے۔ وہاں سے واپس ہوئے اور رست کا ساحل چھوڑ کر ناریلوں کے نیچے آ گئے۔ ناریل کے درختوں کی چھاؤں میں بڑی خوشبودار جنوب مشرقی ایشیائی گرمانش تھی۔ یہ میری روح اور میرے جسم کا حصہ تھی۔ مجھے ناریل کے درختوں میں آکر بڑا سکون محسوس ہوا اور میں نے سگریٹ سلا لیا۔ ناریل کے درخت مجھے سگریٹ سلا تا دیکھ کر ہنس پڑے۔

ڈھاکہ میں ہماری مصروفیت بہت زیادہ تھیں۔ پھر بھی میں اور اشفاق احمد وقت نکال کر محمد پور چلے جایا کرتے تھے۔ وہاں میرے رشتے میں بھائی شاہد رشید بیٹ، فاروق بیٹ اور ذوالفقار بیٹ کا قالیوں کا شوروم تھا۔ وہاں ہمیں گھر کی بنی ہوئی کشمیری سبز چائے بھی ملتی تھی۔

ایک روز میں اور اشفاق احمد ذوالفقار بیٹ کی گاڑی میں بیٹھ کر شمال

شرق کی جانب شہر سے بہت دور نکل گئے۔ یہ بڑے امن امان کا زمانہ تھا۔
 ڈھاکہ سے کوئی تیس چالیس میل دور منہل کے گھنے درختوں میں شاہد بٹ
 نے ایک چھوٹا سا کالچ بنوایا ہوا تھا جہاں وہ اپنی فیملی کے ساتھ پک تک مٹانے
 چلا جاتا تھا۔ یہ لکڑی کا بڑا خوبصورت کالچ تھا۔ آگے پر آمہ تھا۔ زمین سے کوئی
 چار فٹ بلند بانس کے بڑے بڑے ستونوں کے اوپر یہ کالچ تعمیر ہوا تھا۔ ہم
 کا آگے نیچے سے جھک کر گذر جاتے تھے۔ ایک جانب کیلے کے درخت تھے۔
 چھوٹی سی بھتی میں اتناں گئے تھے۔ ہم نے سارا دن وہاں گزارا۔ شام کو
 واپس آئے۔ اشفاق کو وہ جگہ بڑی پسند آئی۔ کہنے لگا۔

”ایسا ایک کالچ ہمیں بھی لاہور کے شور بنگارے سے دور بنانا
 چاہیے۔“
 میں نے کہا۔

”میں زمین پر تو ایسا کالچ نہیں بنا سکتا۔ مگر ایسا ہی ایک کالچ میں نے
 اپنے اندر بنالیا ہوا ہے۔ جب دل چاہتا ہے اسی کے برآمدے میں
 منہل کے درختوں کے پاس سگریٹ سلکا کر بیٹھ جاتا ہوں۔“
 اشفاق ہنس کر کہنے لگا۔

”تم ہر وقت رونا تک باتیں نہ کیا کرو بچو! حقیقی زندگی کی گرم لو
 چلی تو تمہارے کالچ کے سارے پھول مرجھا جائیں گے۔“
 میں نے ہنس کر کہا۔

”میں تو اس کالچ کی خوبصورتی ہے کہ وہاں کبھی لو نہیں چلتی اور
 اس کے پھول کبھی نہیں مرجھاتے۔“

لیکن یہ تو تصوراتی باتیں ہیں۔ اشفاق ٹھیک کہہ رہا تھا۔ مگر اسے یہ
 بات بھی اچھی طرح معلوم تھی کہ میں حقیقت کی دنیا میں زندگی بسر کرتا ہوں۔
 بلکہ اس سے زیادہ حقیقت کی زندگی بسر کر رہا ہوں۔ جتنی گرم لو میں نے دیکھی
 ہے اس نے نہیں دیکھی۔

بہر حال ذوالفقار بٹ کے منہل اور کیلے کے درختوں والے کالچ میں
 کچھ وقت گزار کر اسے بڑی خوشی حاصل ہوئی تھی اور میں بھی چاہتا تھا۔ اب
 ہمارا مشرقی پاکستان کا سفر شروع ہو گیا۔ اس کو جمہوریت کے سفر کا نام دیا گیا تھا۔
 نہ تو مجھے جمہوریت سے دلچسپی تھی اور نہ میں اس کے مضموم سے واقف تھا۔
 مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ میں دوستوں کے ساتھ جنوب مشرقی فضاؤں میں
 سفر کر رہا ہوں۔ میرے لئے یہی سب سے بڑی جمہوریت تھی۔ کئی روز تک یہ
 جمہوری ترین چلتی رہی۔ مشرقی پاکستان کے سارے اہم شہر دیکھے۔ دریاؤں پر
 سے گذرے۔ جنگلوں میں سے گذرے جہاں دیوار کے درختوں کی ٹھنڈی
 خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ رائگا متی کے پہاڑی رست ہاؤس کے برآمدے میں
 کھڑے ہو کر دوسری طرف نیچے بستے کرنا فلی دریا کو دیکھا۔ دریا پار سندھ بن
 کے جنگل کی جھلک دیکھی۔ اس جنگل میں زرد دھاری دار شیر پائے جاتے ہیں۔
 انہیں بنگال ٹائیگر کہا جاتا ہے۔

سلیٹ میں ہم چائے کے بانگوں میں گئے۔ پہاڑی ڈھلانوں پر چائے کے
 سرسبز پودے ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ آگے دور نیچے تک چلے گئے تھے۔
 کہیں کہیں عورتیں چائے کی پتیاں چتی نظر آ رہی تھیں۔ یہاں باغ کے فیجر
 نے مجھے چائے کا ایک پیکٹ دیا۔ کہنے لگا۔

”یہ خاص چائے ہے۔ اس میں رنگ نہیں ملایا گیا اور اسے
 Blend بھی نہیں کیا گیا۔ یہ بالکل اصلی چائے ہے اور ہم یہ چائے
 خاص خاص مہمانوں اور چائے کے شوقین لوگوں کو دیتے ہیں۔“
 سلیٹ میں ہم ایک کارخانہ دار سیٹھ کی کوٹھی میں ٹھہرے ہوئے تھے۔
 اشفاق تو کسی دوسری جگہ پر ٹھہرا تھا۔ میں نے اسے کہا۔

”شام کی چائے تم میرے ساتھ ہی پیو۔ میں یہ خاص چائے
 تمہارے ساتھ پینا چاہتا ہوں۔“
 ہم تھوڑی دیر سلیٹ ریلوے سٹیشن پر اپنی جمہوریت ٹرین میں رہے۔

پھر میں اشفاق کو لے کر اس کو خفی میں آگیا جہاں مجھے اور ابن انشاء کو ایک چھوٹا سا بند روم دے دیا گیا تھا۔ میں نے نوکر سے کہہ کر کیتلی منگوائی، پیالیاں منگوائیں۔ پھر اسے گرم پانی لانے کو کہہ میں نے ٹیکٹ کھول کر چائے کی خوشبو سوکھیں۔ یہ عجیب سرسبز قسم کی خوشبو تھی۔ میں نے چائے کے دو چمچ کیتلی میں ڈال دیئے۔ نوکر گرم پانی لایا تو اس میں گرم پانی ڈال کر فی کوزی سے بند کر دیا۔ پورے دس منٹ بعد کیتلی میں سے چائے پیالیوں میں ڈالی تو ایسا معلوم ہوا جیسے طلوع ہوتے سورج کی کرنوں نے چائے کی شکل اختیار کر لی ہے۔ ہر دونوں نے بڑے اہتمام سے اس کا ایک ایک گھونٹ پی کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

”کیا خیال ہے؟“ میں نے پوچھا۔

اشفاق نے ہنسنیں سیڑ کر کہا۔

”یہ چائے میری سمجھ میں نہیں آئی۔“

چائے میری سمجھ میں بھی نہیں آئی تھی۔ مگر آخر وہ چائے تھی اور اصلی چائے تھی۔ دراصل ہمیں انگریزوں نے Blend کی ہوئی چائے کی عادت ڈال دی تھی۔ ہمارا چائے کا مزاج انگریزوں کا بنایا ہوا ہے۔ بہر حال مجھے اس چائے میں کم از کم چائے کے باغوں کی مہک ضرور مل گئی تھی۔

ہماری لاہور والہی کی تیاریاں شروع ہو گئیں تھیں کہ مشرقی پاکستان کے شاعر جسیم الدین نے تمام ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کو اپنے ہاں دعوت پر بلالیا۔ قوی جسیم الدین کے گھر کے آگے ایک چھوٹا سا تالاب تھا جس میں ایک کشتی نہ جانے کب سے اونڈھی پڑی تھی۔ مکان کے دروازے پر ایک چھوٹی معصوم بچی چنبیلی کے پھولوں سے بھری ہوئی چنگیر لئے کھڑی تھی۔ وہ ہر مہمان کا استقبال چنبیلی کا ہار اس کے گلے میں ڈال کر کرتی۔ ہمیں یہ معصوم استقبال بڑا اچھا لگا۔ قوی جسیم الدین بڑی گرجو شکی کے ساتھ ہر مہمان سے منہ لٹو کر رہا تھا۔ کھانے میں اس نے بنگال کی خاص دھن وال بھات اور کھیر

کی تھی جو بے حد لذیذ تھی۔ کھانے کے بعد توڑے کا دور چلا اور پھر گانے بانے کی محفل شروع ہو گئی۔ جسیم الدین نے ایک سکول کے میوزیکل گروپ کو بلایا ہوا تھا۔ ان میں ایک دسویں جماعت کی ایک لڑکی بھی تھی جس کا نام مرثا تھا۔ یہ لڑکی بعد میں خٹم کے نام سے بطور قلم ایکٹریس بڑی مشہور ہوئی۔ اس وقت یہ لڑکی تھی اور اس نے بڑے کمال کا رقص کیا۔

کافی دیر تک گانے بجانے کی یہ محفل جاری رہی۔ پھر ہم لوگ اپنے اپنے گھمکابوں پر آگئے۔ اس سے اگلے روز دھاکے میں ہماری مسروفیات ختم دگئیں۔ اور ہماری واپسی کا سفر شروع ہو گیا۔ میں اور ابن انشاء ایک ہی جہاز میں دھاکے سے کراچی پہنچے۔ وہ کراچی میں ہی رک گیا۔ میں دوسرے روز لاہور پہنچ گیا۔

اب میں آپ کو اشفاق احمد کا ایک اور واقعہ سناؤں گا۔ یہ وہ واقعہ ہے جسے میں نے آج تک نہ تو کسی کو بتایا ہے اور نہ اس کا ذکر کسی کتاب میں لیا ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اشفاق نے مجھے منع کر رکھا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس واقعے کی تشہیر ہو۔ اس نے ایک ٹکلی کی تھی اور اسے دریا میں ڈال دیا تھا۔ آج میں یہ واقعہ دریا میں سے نکال کر آپ کے لئے یہاں قلم بند کر رہا ہوں۔ یقین کریں اس کے لئے میں نے اشفاق سے کوئی اجازت نہیں لی۔ وہ اگر مجھ سے ناراض ہو گا تو میں اسے سنبھال لوں گا۔

راکھ پارک میں ایک قلم کھینی کا دفتر ہوا کرتا تھا جس کا ایک تہ خانہ بھی تھا۔ رات کو اس تہ خانے میں بیٹھ کر کچھ دوست بیٹھ کر بات کرتے تھے۔ کبھی کبھی میں بھی اس محفل میں شریک ہو جاتا تھا۔ یہ سب آپس میں بے تکلف دوست تھے اور تقریباً سب کا تعلق قلم اور آرٹ کی دنیا سے تھا اور سب پختہ عمر کے ذمے دار لوگ تھے۔ ان کی تفریح صرف اتنی تھی کہ دن بھر کی دوڑ و دوڑ کی تھکان اتارنے کے لئے مل بیٹھتے اور نئے کلام کا لطف اٹھاتے۔ یہاں کبھی کوئی ہنگامہ نہیں ہوا تھا۔ کبھی دھمک چوکڑی نہیں مچی تھی جو اس قسم

کے ماحول کا تقاضا تھا۔ زیادہ تر یہ لوگ قسموں یا قسم کی کمائیوں اور آرٹ کی باتیں کرتے۔ اگر کسی کو زیادہ چڑھ جاتی تو وہ اجازت لے کر وہاں سے چل دیتا۔ کسی غیر آدمی کو وہاں آنے کی اجازت بھی نہیں تھی۔ ایک رات ایسا ہوا کہ اس منٹل میں بیٹھے والا ایک آدمی اپنے کسی دوست کو ساتھ لے آیا۔ اس دوست کے ساتھ ایک لڑکی بھی تھی۔ اس نے یہی بتایا کہ یہ لڑکی کراچی میں ماڈلنگ کرتی ہے اور اس کے ساتھ وہ شادی کرنے والا ہے۔ سب کا موڈ آن ہو گیا۔ کیونکہ وہاں کبھی کوئی عورت نہیں آئی تھی۔ بہر حال محفل شروع ہوئی۔

لڑکی نے نسواری برقعہ پہن رکھا تھا۔ چہرے کا نقاب ہٹا ہوا تھا۔ سانولی سی معمولی شکل و صورت کی لڑکی تھی اور وہ کچھ گھبرائی ہوئی سی بیٹھی تھی۔ آہستہ آہستہ محفل گرم ہوتی گئی۔ باتوں میں گرجو شئی آگئی۔ جو آدمی لڑکی کو ساتھ لایا تھا اس نے لڑکی کے ساتھ بے تکلف ہونا شروع کر دیا۔ لڑکی بار بار سہٹ جاتی تھی۔ جس آدمی کا وہ دفتر تھا اس کو یہ بات سخت ناگوار لگی۔ اس نے کہا۔

”بھائی جان! یہ ٹھیک ہے کہ یہ آپ کی منگیت ہے مگر میں آپ کو یہاں اس قسم کی حرکتوں کی اجازت نہیں دوں گا۔“

جو آدمی اس شخص کو اپنے ساتھ لایا تھا اس نے فوراً اپنی طرف سے معذرت پیش کی اور اپنے دوست سے کہا۔

”یار! تم اپنی ہونے والی بیوی کو لے کر ساتھ والے کمرے میں چلے جاؤ۔ جاؤ۔“

وہ شخص فوراً لڑکی کو بازو سے کھینچتا ہوا وہاں سے نکل گیا۔ تھوڑی سی دیر بعد دوسرے کمرے سے لڑکی کے پیچھے کی آوازیں بلند ہوئیں۔ وہ چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی۔

”مجھے بچاؤ، مجھے بچاؤ، یہ مجھے مار رہے ہیں۔“

ہم بھاگ کر دوسرے کمرے میں گئے تو دیکھا کہ اس آدمی نے لڑکی کو زمین پر گرایا ہوا ہے۔ ہاتھ میں چاقو ہے اور اسے قتل کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ سب نے فوراً آدمی کو قابو کر کے اس کے ہاتھ سے چاقو چھین لیا۔ لڑکی کے حواس گم تھے۔ وہ کونے میں کھٹی کھٹی پھٹی آنکھوں سے سب کو دیکھ رہی تھی۔ وہ شخص بار بار کہہ رہا تھا۔

”تم کون ہوتے ہو ہمارے معاملے میں دخل دینے والے۔ چھوڑ دو مجھے۔ میں اس کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ میں پورے پانچ سو روپے دے کر اسے لایا ہوں۔ یہ کیا سمجھتی ہے۔“

اس شخص کی سب نے ٹھکائی کی۔ دفتر کے مالک نے اسے حکم دیا۔

”ابھی یہاں سے نکل جاؤ نہیں تو میں تمہیں پولیس کے حوالے کر دوں گا۔“

”میں اس عورت کو ساتھ لے کر جاؤں گا۔“

لڑکی نے چیخ کر کہا۔

”خدا کے لئے مجھے اس کے ساتھ نہ بھیجیں۔ یہ مجھے قتل کر دے گا۔“

اس محفل میں بیٹھے والے جس شخص کے توسط سے وہ آدمی وہاں لڑکی کو لے کر آیا تھا۔ اس نے پوری طاقت سے اس کے منہ پر تھپڑ مارا اور گالی دے کر کہا۔

”بندے کے پتر ہو تو اسی وقت یہاں سے نکل جاؤ۔ نہیں تو میں خود تمہیں پولیس کے حوالے کر دوں گا۔ نکل جاؤ یہاں سے۔“

وہ آدمی بڑبڑکرتا دھمکیاں دیتا وہاں سے چلا گیا۔ لڑکی اس کمرے میں سہمی ہوئی بیٹھی رہی۔ سب کا نشہ ہرن ہو گیا تھا۔ سوال یہ تھا کہ اب اس لڑکی کا کیا کیا جائے۔ یہ لوگ کاروباری قسم کے شریف لوگ تھے۔ سب گھر بار والے تھے۔ رات کو محض تھوڑی سی تفریح کے لئے وہاں بیٹھ جاتے تھے۔

سب کے ذہن میں ایک ہی سوال تھا کہ لڑکی کا کیا کریں؟ لڑکی سے پوچھا تو اس نے کہا کہ میرا یہاں کوئی نہیں ہے۔ یہ شخص مجھے چنڈی کے ایک گاؤں سے بلا پھسلا کر لے آیا تھا۔ میں اس کے بھکانے میں آگئی۔ کسی نے کہا۔

”اسے پولیس کے حوالے کر دو۔ وہ اسے خود اس کے گھٹوں پہنچا دے گی۔“

کسی نے کہا۔

”یہ غلطی مت کرنا۔ اگر لڑکی جیسا کہ وہ کہہ رہی ہے اگر کسی شریف گھرانے کی ہے تو تھانے لگی تو داغ لگ جائے گا۔“

”تو پھر اسے کہاں پہنچایا جائے؟“

سب کے ذہن میں یہی ایک سوال تھا۔ کوئی بھی اسے اپنے ساتھ گھر لے جانے اور پھر اس کے گاؤں پہنچانے پر تیار نہیں تھا۔ سب بال بچے دار تھے اور پھر یہ بھی خیال تھا کہ ہو سکتا ہے لڑکی جھوٹ بول رہی ہو۔ یہ کوئی پیشہ ور آدمی نہ ہو۔ خواہ مخواہ کی بدنامی مول لینے کے لئے کوئی بھی تیار نہیں تھا۔ میں ان میں سب سے چھوٹا تھا۔ اگرچہ میری دو سال پہلے شادی ہو چکی تھی۔ میں نے دفتر کے مالک سے کہا۔

”اس کو میں اپنے گھر لے جاتا ہوں۔ صبح اسے لے کر اس کے گاؤں چلا جاؤں گا۔“

سب کے ذہن سے جیسے بوجھ سا اتر گیا۔ سب فوراً راضی ہو گئے۔ یہ ٹھیک ہے۔ بس تم اسے اپنے گھر لے جاؤ۔ اپنی طرف سے ہر کوئی اس لڑکی کی بلا میرے سر ڈالنا چاہتا تھا۔ میں نے لڑکی کی طرف دیکھا اور اس سے پوچھا کہ کیا وہ میرے ساتھ چلنے پر راضی ہے؟ اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”چلی چلوں گی۔ مگر خدا کے واسطے مجھے میرے گھر ضرور پہنچا دے۔“

مجھے بھی تھوڑی تھوڑی چیزیں ہوئی تھیں۔ تمہ خانے کی گرما گرمی اور

جذبات میں آکر میں نے لڑکی کی ذمہ داری تو قبول کر لی تھی لیکن جب آدمی رات کے وقت اسے لے کر تمہ خانے سے باہر نکلا اور باہر کی ٹھنڈی ہوا لگی تو کچھ ہوش آ گیا اور میں سوچنے لگا کہ یہ میں نے کیا فیصلہ کیا ہے۔ اس لڑکی کو گھر لے کر گیا تو بیوی کیا کہے گی؟ اور اوپر سے میں نے تھوڑی سی بھی رکھی ہے۔ عام طور پر میں نشہ ہرن ہونے کے بعد گھر کا رخ کرتا تھا۔ تاکہ گھر میں کسی کو پتہ نہ چلے اور گھر میں ”تے ہی سو جایا کرتا تھا۔“

دل میں یہ خیال بھی بار بار آتا کہ ہو سکتا ہے لڑکی جھوٹ بول رہی ہو اور اس کا تعلق کسی پیشہ ور گروہ سے ہو۔ سردیوں کا موسم تھا۔ رائل پارک کا علاقہ سستان تھا۔ میں نے لڑکی کو ایک جگہ کھڑا کیا اور کہا۔

”دیکھو بی بی! میں کوئی شریف آدمی نہیں ہوں لیکن میں عورت کی عزت کی قیمت کو جانتا ہوں۔ مجھے سچ بچتا دو کہ تم اصل میں کہاں سے آئی ہو اور اس آدمی کے ساتھ تمہارا کیا تعلق تھا۔“

لڑکی رونے لگی۔

”مجھ سے قسم لے لو۔ میں غریب لڑکی ہوں میں کبھی گھر سے باہر نہیں نکلی تھی۔ یہ آدمی مجھے دھوکے سے لے آیا ہے۔ تم مجھے اپنے گھر لے چلو۔ میں تمہیں سارا قصہ سنا دوں گی۔ خدا کے واسطے مجھے تھانے مت لے جانا۔ میرے بوڑھے باپ کو پتہ چلا تو وہ وہیں مر جائے گا اسے پہلے ہی فانی ہوا ہوا ہے۔“

تب میں نے سوچا کہ اب اس لڑکی کا ہاتھ پکڑا ہے تو اسے چھوڑنا نہیں چاہیے۔ لڑکی پر اعتبار کرو اور ”گے جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ میں بڑا جذباتی ہو گیا۔ میں نے لڑکی سے کہا۔

”ٹھیک ہے۔ آؤ میرے ساتھ۔“

میں نے اسے ساتھ لے کر کشمی چوک میں آگیا۔ اس زمانے میں رکشا وغیرہ نہیں ہوا کرتے تھے۔ عینکی بھی بڑی مشکل سے نظر آتی تھی۔ میں نے

تاکہ لیا اور اسے ساتھ بٹھا کر اپنے گھر کی طرف جانے کی بجائے اشفاق کے گھر کی طرف چل پڑا۔ یہ خیال اچانک میرے دماغ میں آیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اشفاق اس سلسلے میں ضرور کچھ نہ کچھ کر لے گا۔ میں نے اس کا ایک خالی گیراج دیکھا ہوا تھا۔ میں نے سوچا کہ لڑکی کو رات اس گیراج میں سلا دیں گے۔ آدھی رات گزر چکی تھی۔ میلوڑ روڑ خالی خالی تھی۔ تاکہ اشفاق کے پہلے والے گھر کی طرف چلا جا رہا تھا۔

آدھا گھنٹہ لگ گیا۔ میں نے تاکتے کو ذرا پیچھے ایک درخت کے نیچے کھڑا کیا اور اتر کر اشفاق احمد کے گھر کی طرف بیدھا۔ اس کے برآمدے میں روشنی ہو رہی تھی۔ اندر کمرے میں اندھیرا تھا۔ میں نے کھٹی بجائی۔ کافی دیر بعد نوکرنے ورواڑہ کھولا۔ اس نے مجھے پہچان لیا۔ میں نے اشفاق کا پوچھا۔ اس نے کہا۔ ”جی وہ سو رہے ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”انہیں جگا دو اور میرا نام بتاؤ۔“
نوکر چلا گیا۔ چھ سات منٹ گزر گئے۔ دروازہ ایک بار پھر کھلا۔ اس بار اشفاق گرم چادر کی بھل مارے باہر آیا۔ مجھے دیکھ کر بولا۔
”خیر تو ہے۔ تم اس وقت؟“
میں نے کہا۔

”ادھر آ جاؤ۔ تم سے ایک ضروری بات کہنی ہے۔“
میں اسے مکان کی دیوار کے پاس لے گیا اور جلدی جلدی سارا قصہ کہانی بیان کر دی۔ اشفاق غور سے سنتا رہا۔ جب میں نے بات ختم کی تو وہ بولا۔

”تم بیسے احمق ہو۔ خواہ مخواہ مجھے بھی کسی مصیبت میں پھنساؤ گے۔ اس لڑکی کو سیدھا تھانے لے جاؤ اور پولیس کے حوالے کر کے اپنے گھر واپس چلے جاؤ۔“
میں نے کہا۔

”اشفاق میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ لڑکی شریف ہے۔ میں نے بہت پیشہ ور عورتیں دیکھی ہوئی ہیں۔ میں ان کی چال پہچان لیتا ہوں۔ یہ لڑکی ایسی نہیں ہے۔ اگر اس وقت ہم نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا تو کل یہ ضرور پیشہ ور عورت بن جائے گی۔ قدرت شاید اسی لئے اسے ہمارے پاس لے آئی ہے کہ وہ اسے گناہ کی دلدل میں گرنے سے بچانا چاہتی ہے۔“

اشفاق پر کچھ میری باتوں کا اثر ہوا اور کچھ اس کی فطری انسانی ہمدردی ر ر حم دلی بیدار ہوئی۔ کہنے لگا۔
”تو پھر تم کیا مشورہ دیتے ہو؟“
میں نے کہا۔

”میرا پروگرام یہ ہے کہ لڑکی کو رات تمہارے مکان کے گیراج میں سلا دیتے ہیں۔ صبح اسے لے کر پنڈی روانہ ہو جائیں گے اور جس کی یہ امانت ہے اس کے حوالے کر کے واپس آ جائیں گے۔ لیکن تمہیں میرے ساتھ ضرور چلنا ہوگا۔ کیونکہ تم مدد آوی گئے ہو اور تم بڑی اچھی طرح بات کر لیتے ہو۔“

اشفاق ساتھ چلنے پر تیار ہو گیا۔ لڑکی کو تاکنے میں سے اتار کر لے آیا۔ ناک نے برآمدے والے بلب کی روشنی میں لڑکی کے ویران ویران چہرے کو دیکھا۔ وہ اندر چلا گیا۔ لڑکی پریشان تھی۔ مجھ سے کہنے لگی۔
”آپ مجھے میرے گھر چھوڑ آئیں گے نا؟ میں ساری عمر آپ کو دعاؤں دیتی رہوں گی۔“
میں نے اسے کہا۔

”فکر نہ کرو۔ رات تم اس جگہ آرام سے سو جاؤ۔ صبح میں اور میرا دوست ہم دونوں تمہیں بس میں بٹھا کر تمہارے گھر چھوڑ آئیں گے۔“

اشفاق نے اندر سے گیراج کا دروازہ کھول دیا۔ گیراج میں ایک چارپائی پہلے سے بچھی ہوئی تھی۔ ابھی اشفاق کے پاس گاڑی نہیں تھی۔ ہم نے لڑکی کو چارپائی پر آرام کرنے کے لئے کما اور خود باہر آگئے۔ اشفاق کہنے لگا۔

”تم اس وقت کہاں گھر جاؤ گے۔ تم بھی یہاں ڈرائیونگ روم میں سو جاؤ۔ میں تمہیں کھیل لاتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے میں بھی یہیں سو جاتا ہوں۔ صبح تمہارے نوکر کے ہاتھ گھر پیغام بھجوادوں گا کہ مجھے ضروری کام سے اچانک شہر سے باہر جانا پڑ گیا ہے۔“

میں نے بھی رات اشفاق کے گھر میں گزار دی۔

صبح اٹھ کر ہم نے ناشتہ کیا۔ لڑکی کو بھی ناشتہ کرایا اور پھر میں اور اشفاق اسے لے کر پنڈی جانے والی بسوں کے اڈے پر آگئے۔ یہاں سے جو پہلی بس ملی اس میں بیٹھے اور بس اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئی۔ سردیوں کا موسم تھا۔ بس راولپنڈی پہنچی تو شام گھری ہوئے گئی تھی۔ دن ڈوب چکا تھا۔ لڑکی نے اپنا نام شمیم بتایا تھا۔ شمیم کا گاؤں وہاں سے بچپاس میل دور تھا۔ بس اڈے پر ہم نے چائے وغیرہ پی اور پھر وہ سری بس پکڑ کر شمیم کے گاؤں کی طرف چل پڑے۔

سردی میں اضافہ ہو گیا تھا۔ آسمان پر بادل چھا گئے تھے۔ سرد ہوا چلنے لگی تھی۔ کبھی سڑک تھی۔ بس کی رفتار کم تھی۔ دو گھنٹے ہمیں وہاں پہنچتے ہوئے لگ گئے۔ شمیم نے بس سے اترتے ہی ایک طرف اشارہ کر کے کہا۔

”ان درختوں کے پاس ہمارا گاؤں ہے۔“

شام کا اندھیرا گہرا ہو گیا تھا۔ ایک پگ ڈنڈی کھیتوں میں سے گذرتی ان درختوں کی طرف چلی گئی تھی۔ جن کی طرف لڑکی نے اشارہ کیا تھا۔ ہم ایک دوسرے کے آگے پیچھے پگ ڈنڈی پر چل رہے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ لڑکی کچھ گہرائی گہرائی سی ہے اور مجھ سے کوئی بات کرنا چاہتی ہے۔ میں نے

اس سے پوچھ ہی لیا کہ کیا بات ہے۔ اب تم کیوں پریشان ہو؟ اب تو ہم تمہیں تمہارے گھر لے آئے ہیں۔ لڑکی رک گئی۔ اشفاق بھی رک گیا۔

لڑکی نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

”مجھے معاف کروینا۔ میں نے یہ بات تمہیں پہلے نہیں بتائی تھی۔

مجھے ڈر تھا کہ کہیں تم مجھے میری حالت پر نہ چھوڑ دو۔“

”کیا بات ہے؟ کھل کر بتاؤ۔“ اشفاق نے لڑکی سے کہا۔

لڑکی کی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے۔ کہنے لگی۔

”میری ماں بچپن میں ہی مر گئی تھی۔ میرے باپ کو فالج ہو گیا ہوا

ہے۔ وہ بستری پر سے اٹھ بھی نہیں سکتا۔ میرے باپ کا ایک سوتلا

بھائی ہے۔ وہ گاؤں کا بد معاش ہے۔ شراب بنا کر بیچتا ہے۔ وہ مجھ

سے ناجائز وعدہ کرنا چاہتا ہے۔ اسی نے مجھے اس آدمی کے ہاتھ

پانچ سو روپے لے کر بھیجا تھا مگر وہ آدمی مجھے ہٹا پھسلا کر لاہور لے

گیا۔“

”تم کتنا کیا چاہتی ہو؟“ میں نے سوال کیا۔

لڑکی بولی۔

”میں یہ کتنا چاہتی ہوں کہ میرے باپ کا سوتلا بھائی یہاں کا

بد معاش ہے۔ وہ دو قتل بھی کر چکا ہے۔ اسے پتہ چل گیا کہ میں

اچھی ہوں تو وہ مجھے گھر سے زبردستی اٹھا کر اپنے ڈیرے پر لے

جائے گا۔ میرا بیمار باپ تو اس کا ہاتھ بھی نہ پکڑ سکے گا۔ تم دونوں

میرے لئے فرشتے بن کر اترے ہو۔ تم نے میری عزت بچائی ہے تو

اب مجھے اس بد معاش سے بھی کسی طرح بچاؤ۔ نہیں تو میری

ساری زندگی برباد ہو جائے گی۔“

اشفاق نے کہا۔

”بی بی! یہ تمہارے گھریلو جھگڑے ہیں ہم اس میں دخل نہیں دیتا

چاہتے۔ ہمارا کام تمہیں گناہ کی زندگی سے بچا کر تمہارے باپ کے پاس پہنچانا تھا۔ سو ہم نے پہنچا دیا۔

لڑکی نے روتے ہوئے ہاتھ جوڑ دیے۔

”خدا کے لئے مجھے اس بد معاش سے بچالو۔“

”ہم کیا کر سکتے ہیں؟“ میں نے جھنجھلا کر کہا۔

لڑکی بولی۔

”تم میری شادی کرم داد سے کروا دو۔ بس پھر وہ بد معاش میرا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔“

”یہ کرم داد کون ہے؟“ اشفاق نے پوچھا۔

”ہماری برادری کا ہے۔ پڑی میں رکشا چلاتا ہے۔ ہم ایک

دوسرے کو پیار کرتے ہیں۔ ہم شادی کرنا چاہتے ہیں۔ مگر اس

بد معاش نے کرم داد کو کھرا رکھا ہے کہ اگر تم نے خیم سے شادی

کا نام لیا تو تمہارے ٹوٹے کروسیے جائیں گے۔“

اشفاق بولا۔ ”تو وہ تو اس کے ٹوٹے کر دے گا۔“

لڑکی نے اشفاق کا بازو پکڑ لیا۔

”مرد بن کر مجھے یہاں میرے باپ کے پاس لائے ہو۔ اب کرم داد

سے میرا بیاہ بھی کرا دو۔ آگے جو ہو گا میں دیکھ لوں گی۔ تمہارے

پاس مدد مانگتے نہیں آؤں گی۔“

اشفاق کا چہرہ تانے کی طرح روشن ہو گیا۔ دو تین سیکنڈ وہ چپ رہا۔ پھر

گہری آواز میں بولا۔

”ٹھیک ہے۔ اگر تمہارا باپ اس بیاہ پر راضی ہے تو میں اور میرا

دوست ہم دونوں تیرے ساتھ ہیں اور یہاں سے تمہارا بیاہ کروا کرتی

واپس جائیں گے۔“

لڑکی کا چہرہ مکمل اٹھا۔ اس کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

”بہادر مائی کے لال ہو۔ آؤ میرے باپ سے ملو۔“

اس کا باپ بوسیدہ سے کواٹر نما مکان کے کمرے کے کونے میں لحاف

دون تک کئے بالکل سیدھا چڑا تھا۔ وہ صرف گردن بلا سکتا تھا۔ اپنی بیٹی کو

بٹھا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ لڑکی نے باپ کا ہاتھ چوم لیا اور اس

سے شروع سے لے کر آخر تک ساری داستان بیان کر دی۔ ہم نے اس کے

پ سے پوچھا کہ کیا وہ اپنی بیٹی کا بیاہ کرم داد سے کرنے پر راضی ہے؟ باپ

نے نچیت آواز میں کہا۔

”میں راضی میرا خدا راضی۔“



غیم کے باپ کا جو بد معاش ٹائپ کا سوتلا بھائی تھا اس کا نام تو کچھ اور تھا آپ اسے کالیا کہہ لیں۔ غیم کے باپ نے بھی اس خدشے کا اظہار کیا کہ کالیا اس کی بیٹی اور کرم داد کی جان لے لے گا۔ اشفاق نے کہا۔

”ہم اسے سنبھال لیں گے۔ آپ کرم داد کو بلائیں۔ مولوی صاحب کو بلائیں۔ اپنے دو ایک بزرگ محلے داروں کو بلائیں اور لڑکی کا نکاح پرہیز کر خست کریں۔“

اشفاق کی باتوں سے غیم کے باپ کو حوصلہ ہو گیا۔ رات ہم نے اسی کواٹر میں بسر کی۔ دوسرے دن غیم نے اپنے ایک ماموں کو بلوایا۔ ماموں نے سارا بندوبست کر دیا۔ ابھی تک کالے بد معاش کو خیر نہیں ہوئی تھی۔ دوپہر کو غیم کا نکاح کرم داد کے ساتھ ہو گیا اور اس نے اسی گھر میں اپنے خاوند کے ساتھ رہنے کا فیصلہ کیا۔ کرم داد نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ کرم داد بڑا دلیر لہجہ میں ثابت ہوا۔ اسی نے لڑکی کے باپ سے کہا۔

”ابا! تم بالکل نہ گھبراؤ، کالیے کی جرات نہیں ہے کہ وہ ہمارا کچھ بگاڑ سکے۔ میں نے بھی چڑیاں نہیں پہنی ہوئیں۔“

لیکن یہ لڑائی جھگڑے کی بات تھی اور وہاں خون خرابے کا شدید خطرہ تھا۔ میں نے اشفاق سے کہا۔

”ہمیں دونوں میاں بیوی کی حفاظت کا پورا پورا انتظام کرنا

چاہیے۔“

اشفاق کہنے لگا۔

”میں ایسا انتظام کر کے جاؤں گا کہ کالیا روزائیاں آ کر غیم سے

پوچھا کرے گا۔ باقی کوئی خدمت ہو تو بتائیں۔“

مجھے معلوم تھا کہ اشفاق ایسا کر سکتا ہے۔ افسران بالا میں اس کا کافی اثر و رسوخ تھا۔ وہاں گاؤں میں ایک چھوٹا سا پوسٹ آفس تھا۔ اشفاق مجھے ساتھ لے کر پوسٹ آفس آیا۔ یہاں ایک ٹیلی فون موجود تھا۔ اشفاق نے پوسٹ ماسٹر کی اجازت سے پنڈی پولیس ہیڈ کواٹر میں کسی خان صاحب کو فون کیا۔ خوش قسمتی سے وہ مل گئے۔ اشفاق نے کہا۔

”کیا حال ہے یار؟ میں اشفاق احمد بول رہا ہوں۔ نہیں نہیں۔ میں

لاہور سے نہیں پنڈی سے بول رہا ہوں۔“

پھر اشفاق احمد نے اپنے دوست کو جو پولیس کا پیدا افسر تھا۔ اس گاؤں کا حدود اربعہ بتایا اور ساری کٹائی بیان کر دی۔ پوسٹ ماسٹر رجسٹر پر لکھتے لکھتے اشفاق کی طرف دیکھنے لگا۔ اشفاق کہہ رہا تھا۔

”جتنی جلدی پہنچ سکتے ہو پہنچ جاؤ۔ میں یہاں پوسٹ آفس کے باہر

تمہارا انتظار کرتا ہوں۔ بس آ جاؤ۔ یہ بڑا نیک کام ہے۔“

اشفاق نے ہنستے ہوئے خدا حافظ کہا اور فون بند کر کے میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے فوجی لیجے میں بولا۔

”یارے! فکر نہیں۔ کلک آ رہی ہے۔“

ہمیں اندازہ تھا کہ پنڈی سے اشفاق کا دوست پولیس وین میں فل پیڈ پر بھی آیا تو ایک گھنٹہ اسے ضرور لگ جائے گا۔ اتنی دیر ہم پوسٹ آفس کے باہر کھڑے نہیں رہ سکتے تھے۔ میں نے اشفاق سے کہا۔

”چلو! غیم کے ہاں چل کر بیٹھتے ہیں۔ اس کے خاوند اور باپ کو بھی

تسلی دیتے ہیں۔“

ہم غیم کے گھر آ گئے۔ اشفاق نے ساری بات بیان کی اور کہا کہ انہیں کسی قسم کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے سارا بندوبست کر

دیا ہے۔ میرا دوست خان اس سارے علاقے کا انچارج ہے وہ تمہارے ساتھ کسی قسم کی زیادتی نہیں ہونے دے گا۔ تم لوگ امن چین سے زندگی گزارو گے۔ کرم داد اور خیم اور اس کا باپ بڑے خوش ہوئے۔

اس دوران کالیے بد معاش کو خبر مل گئی تھی کہ خیم کا کرم داد سے نکاح ہو گیا ہے۔ ہم لوگ خیم کے گھر میں ہی بیٹھے تھے کہ وہ اپنے چھ سات بد معاشوں کو لے کر وہاں پہنچ گیا۔ آتے ہی اس نے پستول سے دو تین ہوائی فائر کر دیئے۔ کرم داد جوش میں آکر بولا۔

”یہ کالیا ہی ہو سکتا ہے۔ ابھی جا کر میں اس کی بد معاشی نکالتا ہوں۔“

اشفاق نے اور خیم نے اسے پکڑ لیا۔

”کرم داد! بیوقوفی مت کرو۔ امن چین سے یہاں بیٹھے رہو۔ دیکھتے ہیں وہ کیا کرتا ہے۔“

کالیے بد معاش نے باہر سے لاکرنا شروع کر دیا۔ پھر وہ دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔ اس کے ساتھی باہر ہی حکم کے منتظر کھڑے رہے۔ یہ کالیا جھٹے ہوئے جسم کا آدمی تھا۔ شکل ہی سے جرائم پیشہ لگتا تھا۔ اس نے میری اور اشفاق کی طرف دیکھا اور بولا۔

”تم لوگ اس کے حمایتی بن کے آئے ہو۔ میں تم سے بھی نفرت لیں گا۔ پہلے اس بڑھے کی تو خبر لے لوں۔“

کرم داد کھڑا ہو گیا اور کڑک کر بولا۔

”کالیے! خدا کا خوف کرو۔ اگر تو نے کسی کو ہاتھ لگایا تو یاد رکھ یہاں سے تو بھی زندہ بچ کر نہیں جائے گا۔“

کالیے نے دانت چیں کر کہا۔

”تمہیں بھی دیکھ لوں گا۔“

اب اشفاق بچ میں آ گیا۔ اس نے بڑی عقل مندی اور موقع شناسی سے

کام لیتے ہوئے کالیے کو سمجھانا شروع کیا کہ وہ قانون کو اپنے ہاتھ میں نہ لے۔ کرم داد اور خیم میاں بیوی ہیں اگر اس نے کوئی ایسی ویسی بات کی تو قانون کے شکنجے سے نہیں بچ سکے گا۔ ساتھ ساتھ اشفاق احمد کالیے کو نرم لہجے میں سمجھاتا بھی جا رہا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ وقت گزار رہا ہے تاکہ اتنی دیر میں اس کا پولیس افسر دوست وہاں پہنچ جائے۔

اتنی دیر میں اشفاق کا پولیس انسپکٹر دوست پولیس کی پوری گارڈ لے کر پوسٹ آفس پہنچ گیا۔ اس نے اشفاق کو وہاں نہ دیکھا تو پوسٹ ماسٹر سے پوچھا۔ پوسٹ ماسٹر نے کہا کہ وہ گاؤں کی طرف سے آئے تھے۔ اس دوران کالیے کے ساتھیوں نے جو مکان کے باہر کھڑے تھے اشتعال میں آکر ہوائی فائرنگ شروع کر دی۔ اب پولیس کو کسی سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ پولیس انسپکٹر نے پستول نکال لیا اور جس طرف فائرنگ ہو رہی تھی اوھر کو پولیس کی گارڈ لے کر دوڑا۔ اشفاق نے باہر گاڑی رکنے کی آواز سنی تو جلدی سے باہر نکل آیا۔ میں بھی اس کے ساتھ تھا۔ باہر پولیس کی پوری مسلح گارڈ لے کالیے کے ساتھی بد معاشوں سے ہتھیار رکھوا کر انہیں حراست میں لے لیا تھا۔ اشفاق کا دوست بولا۔

”کہاں ہے ان کا سرخند۔“

اشفاق نے انتہائی دانشمندی سے کام لیتے ہوئے کہا۔

”وہ ٹھیک ہو گیا ہے۔ اسے کچھ نہ کہنا۔“

مگر پولیس مکان کے اندر آ گئی۔ کیونکہ کالیا پستول لئے کمرے میں موجود تھا اور پولیس نے اسے دیکھ لیا تھا۔ پولیس انسپکٹر نے کالیے سے کہا۔

”پستول مجھے دے دو۔“

اور آگے بڑھ کر اس نے کالیے کے ہاتھ سے پستول چھین لیا۔ پھر اسے دھکا دے کر کمرے سے باہر گرا دیا اور پولیس سے کہا۔

”لے چلو اسے تھانے۔ اس کی بد معاشی نکالتے ہیں۔“

اشفاق نے پولیس انسپکٹر کا عظیم کرم داد اور عظیم کے بیمار باپ سے تعارف کروایا اور پوری تفصیل سے سارا قصہ سنایا۔ پولیس انسپکٹر نے جس کو اشفاق خان کہہ لیا تھا، گھر والوں کو پوری تسلی دی اور کہا۔

”میرے ہوتے ہوئے یہاں کوئی بد معاش قانون کو اپنے ہاتھ میں نہیں لے سکتا۔ آپ آرام سے رہیں۔ اپنا کاروبار کریں۔ میں ان بد معاشوں کو بالکل سیدھا کر دوں گا۔“

یہ بات میں یہاں جانا بھول گیا ہوں کہ نکاح ٹائے پر لڑکی کی طرف سے اشفاق احمد نے بطور وکیل دستخط کئے تھے۔ میں نے گواہ بن کر دستخط کئے۔ پولیس انسپکٹر کالیے اور اس کے ساتھی بد معاشوں کو گرفتار کر کے لے گئے۔ دھارا اراوہ تھا کہ شام ہونے سے پہلے پہلے وہاں سے لاہور کی طرف روانہ ہو جائیں۔ مگر لڑکی نے کہا۔

”بھائی جان! ابھی نہ جائیں میرا دل نہیں مانتا۔ آج کی رات رہ جائیں میں آپ کا احسان ساری زندگی میں بھولوں گی۔“

میں نے اشفاق سے کہا۔

”یار! جہاں ایک رات گزار رہی ہے۔ وہاں دو سہ رات بھی گزار دیتے ہیں۔ لڑکی کی تسلی ہو جائے گی۔“

ہم نے وہ رات بھی وہیں بسر کی۔ دوسرے دن ہم بتوری روٹی اور کھن کا ناشتہ کر کے فارغ ہوئے ہی تھے کہ باہر گاڑی کی آواز آئی۔ اشفاق نے دروازے کی طرف دیکھا اور کہا۔

”شاید میرا یار خان آیا ہے۔“

عظیم اور کرم داد دروازے کی طرف دیکھنے لگے۔ اسٹن میں دروازے پر کسی نے دھک دی۔ کرم داد نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ باہر پولیس کے چار سپاہی کالیے بد معاش کو لئے کھڑے تھے۔ کالیے نے ہاتھ جوڑے ہوئے تھے۔ جیسے ہی دروازہ کھلا کالیا اندر آیا اور سیدھا لڑکی کے باپ کی چارپائی کی

طرف گیا اور اس کے پاؤں پر سر رکھ کر روتے ہوئے بولا۔

”بھائی! مجھے معاف کر دو۔ میں نے تمہیں بڑے دکھ پہنچائے ہیں۔ خدا کے واسطے مجھے معاف کر دو۔ میں اب کبھی تمہیں دکھ نہیں دوں گا۔“

اس کے بعد اس نے عظیم کی طرف دیکھا اور ہاتھ جوڑ کر بولا۔

”بھئی! تم بھی مجھے معاف کر دو۔ اگر تم نے مجھے معاف نہ کیا تو خدا بھی مجھے معاف نہیں کرے گا۔“

اسی طرح اس نے کرم داد سے بھی معافی مانگی اور اس کو اپنے گھر سے لگالیا۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ کالیے بد معاش کی ایک آنکھ تھوڑی سوجی ہوئی تھی۔ اشفاق کے پولیس افسر دوست نے کالیے کو بالکل سیدھا کر دیا تھا۔ عظیم کرم داد اور اس کے سرسرنے کالیے کو معاف کر دیا۔ کالیا پھر ہم سے معافیاں مانگنے لگا۔ اس نے اشفاق کی طرف دیکھا اور بڑی عاجزی سے بولا۔

”میری ایک عرض ہے حضور! خان صاحب سے کہیں کہ وہ بھی مجھے معاف کر دیں اور مجھے پنڈی تھانے میں نہ بلائیں۔“

اشفاق نے کہا۔

”جب تم نے برائی سے توبہ کر لی ہے اور عہد کر لیا ہے کہ آئندہ تم شریف آدمیوں کی طرح زندگی بسر کرو گے تو پھر خان کو کیا ضرورت ہے تمہیں تھانے بلانے کی؟“

کالیا گردن خمی میں ہلانے لگا۔

”حضور! آپ نہیں جانتے۔ آپ نہیں جانتے“ خان صاحب سے کہ کر تھانے سے میری جان بخشی کرا دیں۔ میں ساری زندگی آپ کا غلام بن کر رہوں گا۔“

اشفاق ہنس پڑا۔

”مگر نہیں کرو۔ میں خان کو کہہ دوں گا۔ وہ تمہیں آئندہ تھانے

نہیں بلانے گا مگر تم بھی اپنے عہد پر قائم رہنا اور شریف بن کر رہنا۔

کالیے بد معاش نے کانٹوں کو ہاتھ لگائے اور کہا۔

”میری توبہ میرے باپ کی بھی توبہ میں نے آج سے سب برے و حسدے چھوڑ دیئے ہیں۔“

پھر وہ لڑکی کے باپ کی پائنتی کے پاس فرش پر بیٹھ گیا اور اس کے فالج زدہ پاؤں دبانے لگا۔

اسی روز میں اور اشفاق لاہور کے لئے واپس روانہ ہو گئے۔ گاؤں کے لاری اڑے پر چھوڑنے کرم داد، حیم اور کالیا بد معاش بھی آیا۔ اس نے سر پر حاجیوں والا زرد رومال باندھ رکھا تھا۔ اشفاق نے اور میں نے سب سے مصافحہ کیا۔ اشفاق نے حیم اور کرم داد کو آپس میں محبت پیار سے رہنے کی تلقین کی اور ہم لاری میں بیٹھ گئے لاری ہمیں لے کر پڑی کی طرف چل پڑی۔ میں نے اشفاق سے کہا۔

”اشفاق تم نے یہ بڑا زبردست ٹیک کام کیا ہے۔ میں بڑا متاثر ہوا ہوں۔“

اشفاق احمد شرمیلی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

”نہیں یار! میں نے تو کچھ بھی نہیں کہا۔ تم نے کہا تو میں نے سوچا کہ ایک شریف بی بی کی زندگی سنور سکتی ہے۔ تو اس کی مدد ضرور کرنی چاہیے۔“

میں نے کہا۔

”پھر بھی یار کون اپنے گھر کا میٹھ آرام چھوڑ کر ایک غریب لڑکی کی خاطر سردیوں میں اتنا سفر کر کے آتا ہے اور جبکہ معاملہ بھی سنگین نوعیت کا ہو۔“

اشفاق بولا۔

”یار! ویسے کالیا بالکل سیدھا ہو گیا ہے۔ میرے یار خان نے اس کی بڑی کارگر ٹھکانی کی ہے۔ اس کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ ان لوگوں سے ایسا ہی ملو کہ کیا جائے تو یہ راہ راست پر آتے ہیں۔“

میں نے کہا۔

”پھر بھی میں کہوں گا کہ کالیے کو خدا نے بھی سیدھی راہ دکھادی ہے۔ ورنہ تھانوں میں تو بڑے بڑے بد معاشوں کی ٹھکانی ہوتی ہے اور وہ ویسے کے ویسے ہی رہتے ہیں۔“

اشفاق اپنی بات پر زور دے کر کہنے لگا۔

”ہاں۔۔۔ یہی تو میں بھی کہتا تھا کہ انسان کے دماغ میں تجویز اللہ میاں کی طرف سے آتی ہے۔ اگر خدا کی مرضی نہ ہو تو انسان لاکھ ہاتھ پاؤں مارے کچھ نہیں ہوتا۔ مجھے یقین ہے کہ یہ خدا کی مرضی تھی کہ کالیا بد معاشی اور جرائم کی دنیا کو چھوڑ کر شریفوں کی صف میں آجائے۔ یہ واقعہ تو ایک بلند تھا۔ اب تم یقین رکھو۔ کالیا ساری زندگی ٹیک بنا رہے گا۔“

بس راولپنڈی کے مضافات میں داخل ہو گئی تھی۔ ہم بس سے اترے و اشفاق کہنے لگا۔

”یار! اپنے یار سے چل کر ملتے ہیں اور اس سے پوچھیں تو سہی کہ اس نے کونسا منتر پڑھ کر پھونکا تھا کہ کالیے بد معاش کی کالیا پلٹ گئی۔“

ہم وہاں سے ٹیکسی لے کر پولیس ہیڈ کوارٹر آ گئے۔ خان کے کمرے میں گئے تو وہ ہمیں دیکھ کر ہنس پڑا۔ اس نے اشفاق سے پوچھا۔

”کیوں پھر؟ ٹھیک ہو گیا نا بد معاش! نکال دی نا ہم نے اس کی بد معاشی۔“

ہم کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ اشفاق نے ہنس کر پوچھا۔
 ”یہ تو ہاؤس کے تم نے کونسا منتر پھونکا تھا۔ وہ تو ساری بد معاشی بھوں
 گیا ہے۔“
 خان ہنس پڑا۔ کہنے لگا۔

”پولیس والوں کے پاس بڑے منتر ہوتے ہیں اور چونکہ یہاں تم سچ
 میں آگے تھے اس لئے میں نے اپنا ایک خاص منتر استعمال کیا تھا۔
 یہ منتر ایسا ہے کہ اگر چنگیز خان بھی ہمارے تھانے میں آجائے اور
 میں اس پر یہ منتر استعمال کروں تو وہ اپنی ساری تلوار بازیاں بھول
 جائے اور پولیس کو سارا حساب بتا دے کہ اس نے کتنے آدمیوں کو
 قتل کیا ہے اور کتنے بے گناہوں کی کھوپڑیوں کے بیٹا بنائے ہیں۔“
 اشفاق نے اپنے دوست کا شکریہ ادا کیا اور کہا۔

”یہ تمہاری فرض شامی اور نیک دلی ہے کہ تم ایک چھٹے ہوئے
 بد معاش کو سیدھی راہ پر لے آئے ہو۔ اچھا یار! اب ہم چلتے
 ہیں۔“
 خان نے کہا۔

”یار! پنڈی آئے ہو تو دو ایک دن میرے پاس بھی رک جاؤ۔ تم
 کب لاہور سے نکلتے ہو۔“
 اشفاق نے کہا۔

”خان! تمہیں معلوم نہیں کہ میں پیچھے کتنے کام ادھورے چھوڑ کر
 آیا ہوں۔ اب مجھے اجازت دو۔ انشاء اللہ دوسری بار آیا تو ضرور
 تمہارے پاس غصہوں کا اور ہاں! لڑکی خیم اور اس کے خاوند کا
 خیال رکھنا۔ ویسے مجھے پورا یقین ہے کہ کالیا کوئی ایسی دلی حرکت
 نہیں کرے گا۔“
 خان نے ہاتھ جھٹک کر کہا۔

”اس کی تو تم فکر ہی نہ کرو۔ میں نے اسے ایسا سیدھا کیا ہے کہ پھر
 کبھی ٹیڑھا نہیں ہوگا اور اس کے ساتھیوں کو تو میں نے تابا کر اسلحہ
 رکھنے اور ہوائی فائرنگ کرنے کے جرم میں حوالات میں بند کر دیا
 ہے اور اس کا مقدمہ تیار کر رہا ہوں۔“

خان نے ہم سے بغل گیر ہو کر خدا حافظ کہا۔ بولا۔
 ”تمہارے پاس گاڑی نہیں ہے کیا؟“
 میں نے کہا۔

”جی نہیں! مگر ہم ٹیکسی کرائیں گے۔ شیشن یہاں سے زیادہ دور
 نہیں ہے۔“

اس وقت دوپہر کے دو بج رہے تھے۔ ہم ٹیکسی میں بیٹھ کر سیدھا شیشن
 پہنچ گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب لاہور سے پنڈی اور پنڈی سے لاہور واپسی ریل کار
 نئی نئی چلی تھی۔ لاہور سے یہ ریل منہ اندھیرے چلا کرتی تھی جبکہ راولپنڈی
 سے تین ساڑھے تین بجے بعد دوپہر چلتی تھی۔ اس میں سیٹ بک کرانی پڑتی
 تھی۔ ہم اللہ توکل آگئے تھے۔ ہمیں دو سیٹیں مل گئیں۔

لاہور ریل کار رات کے نو ساڑھے نو بجے پہنچی۔ اشفاق نے مجھ سے
 وعدہ لیا کہ میں یہ بات کبھی کسی کو نہیں بتاؤں گا لیکن آج میں نے اس کا یہ
 وعدہ توڑ دیا ہے۔ وہ بھی مجھے معاف کر دے اور خدا بھی مجھے معاف کرے۔
 اب اس لڑکی خیم کا مختصر سا ذکر ضرور کروں گا۔

وہ بڑی کامیاب بیوی ثابت ہوئی۔ اس نے گھر گرہستی کو خوب سنبھالا۔
 اس کے ہاں چار لڑکے پیدا ہوئے۔ اشفاق ان کی طرف سے بے خبر نہیں تھا۔
 وہ ان کا حال احوال معلوم کرتا رہتا تھا اور وقت پڑنے پر ان کی مدد بھی کرتا
 تھا۔ کرم داد بھی بڑا اچھا خاوند ثابت ہوا۔ آج خیم بڑی قاریخ الماں زندگی بسر
 کر رہی ہے۔ اس کے چاروں لڑکے برسر روزگار ہیں۔ ان کے بھی بچے ہو گئے
 ہیں۔ گھر میں بھونکیں آگئی ہیں۔ انہوں نے پنڈی میٹا سیٹ ٹاؤن میں اپنا مکان

بنالیا ہے۔ جب کبھی شمیم یا اس کا کوئی بیٹا یا کرم داد لاہور آتے ہیں تو سیدھے اشفاق کے ہاں آتے ہیں اور مجھ سے بھی ملتے ہیں۔ اشفاق سے جب بھی میں اس واقعے کا ذکر کروں تو وہ کان کو انگلی لگا کر یہی کہتا ہے۔
”اللہ کا بڑا کرم ہوا تھا۔“

پاکستان میں پاکستان رائٹرز گلڈ کے قیام میں قدرت اللہ شہاب، جمیل الدین عالی اور اشفاق احمد کی کوششوں کو بڑا عمل و عمل تھا۔ اس گلڈ کے اغراض و مقاصد کیا تھے اور کیا رائٹرز گلڈ یہ اغراض و مقاصد حاصل کرنے میں کامیاب ہوئی؟ مجھے ان سوالوں سے اس وقت کوئی سروکار نہیں ہے میں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ان تین بڑوں کے ارادے ٹیک تھے اور وہ دل و جان سے پاکستان کے ادیبوں شاعروں کی بھلائی چاہتے تھے۔

دوسرے صوبوں کی طرح لاہور میں بھی رائٹرز گلڈ کا دفتر قائم ہو گیا۔ یہ دفتر منگھری روڈ پر ایک متروکہ کوٹھی میں تھا اور اب بھی وہیں پر ہے۔ مگر اب اس کی حالت خستہ ہو گئی ہے اور اس کے چہرے پر وہ رونق اور شادابی نہیں ہے جو کسی زمانے میں ہوا کرتی تھی۔ شروع شروع کے زمانے میں یہاں بڑے جلسے وغیرہ ہوتے۔ باہر سے آنے والے ادیبوں، شاعروں سے ملاقاتیں ہوتیں۔ پاکستان کے کسی بھی صوبے سے کوئی ادیب، شاعر لاہور آتا تو وہ گلڈ کے دفتر میں ضرور آتا۔ میں کس کس کا نام لوں۔ سبھی آتے تھے۔ سب سے ملاقات ہوتی تھی۔

پاکستان رائٹرز گلڈ کا پہلا اجلاس کراچی میں منعقد ہوا تو لاہور سے ہم سب کراچی گئے۔ ایک ٹرین میں سب کی سیٹیں ریڑر تھیں۔ یہ ادیبوں کا قافلہ تھا۔ شیش پر بڑی رونق لگی ہوئی تھی۔ پلیٹ فارم پر ہر طرف ادیب اور شاعر نظر رہے تھے۔ میں اور ابن انشاء جس ڈبے میں بیٹھے تھے اسی ڈبے میں ہمارے ساتھ صوفی تبسم صاحب بھی تھے۔ صوفی صاحب اپنی جگہ پر خود اک انجن تھے۔ پاکستان میں ہر جگہ ان کے مداح اور شاگرد بکھرے ہوئے تھے۔

ان کی شخصیت میں امرتسری کشمیریوں کی بھرپور جھلک نمایاں تھیں۔ لہجہ خالص امرتسری کشمیریوں کا تھا۔ میں اور اشفاق ان کی باتیں بڑے مزے لے لے کر کرنا کرتے تھے۔ ایک بات میں آپ کو تینا بھول گیا ہوں کہ ابن انشاء کی طرح اشفاق احمد میں بھی ظرافت کی حس بہت گہری ہے۔ ہمارا آپس میں مزاج ملا ہوا ہے۔ بڑی بڑی سنجیدہ محفلوں میں اگر ذرا سی کوئی نازک ظرافت والی بات ہو جاتی تو ہم ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا کرتے۔ دوسروں کو کوئی خبر نہ ہوتی کہ ہم کس بات پر محظوظ ہو رہے ہیں۔

کئی بار ایسا بھی ہوتا کہ وہ محفل میں بڑی سنجیدہ اور مدلل گفتگو کرتے کرتے اچانک کسی بات پر میری طرف دیکھتا تو ہم دونوں اپنی ہنسی کو بڑی مشکل سے قابو میں کرتے۔ کئی بار ایسا ہوا کہ ہم ہنسی کو قابو نہ کر سکے۔ میں اجلاس سے اٹھ کر باہر جا کر زور زور سے اکیلا ہی ہنسنے لگ جاتا اور اشفاق یہ کہتا کہ گفتگو کرتے ہوئے کوئی لطیفہ بیان کر دتا اور پھر کھل کر ہنس لیتا۔ ٹرین ابھی لاہور شیش کے پلیٹ فارم پر ہی کھڑی تھی۔ صوفی صاحب رتھ پر سونے کے لئے اپنا نام جھام لگا رہے تھے۔ اشفاق پہلے سے کراچی پہنچ چکا تھا۔ میرے ساتھ ابن انشاء تھا۔ محمود اختر کیانی تھا اور دو تین اور ادیب بھی تھے۔ ٹرین کا وقت ہو گیا۔ گاڑی نے سیٹی بجائی۔ انجن نے وسل دیا اور گاڑی پلیٹ فارم پر ایک جگہ سے دھچکے کے ساتھ ٹھکے لگی۔

شام کے وقت ٹرین چلی تھی۔ راستے میں اب یاد نہیں کونسا شیش آیا۔ گاڑی وہاں رکی تو ایک بڑا مدد قسم کا بزرگ مشفقانہ شاعر ہمارے ڈبے کے پاس آیا۔ صوفی تبسم کھڑکی کے پاس بیٹھے تھے۔ اس نے کہا۔

”صوفی صاحب! آپ ان لوگوں کو جا کر سمجھائیں۔ کچھ شاعر ڈبے میں بیٹھے شراب پی رہے ہیں۔ کوئی دیکھے گا ہم ادیبوں کی بڑی بدنامی ہوگی۔ سارے پریس میں یہ بات آجائے گی۔“

صوفی صاحب کے کان کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے ایک کان کو ہاتھ سے

بھیگتے ہوئے اس بزرگ سے پوچھا۔

”یہ غیبش کوئی ڈبے میں ہیں؟“

بزرگ شاعر نے انجن کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

”یہاں سے تین ڈبے چھوڑ کر پوچھتے ڈبے میں بیٹھے ہیں۔“

صوفی صاحب فوراً اٹھ کھڑے ہوئے۔ ہوتا پھرتا اور ڈبے سے اترتے

ہوئے بولے۔

”ابھی جا کر ان کی خبر لیتا ہوں۔ ان کو شرم آتی چاہیے۔“

صوفی صاحب اگلے ڈبوں کی طرف تیز قدم اٹھاتے چلے گئے۔ وہ

بزرگ شاعر جنہوں نے ہجری کی تھی وہ بھی اپنے ڈبے میں جا کر بیٹھ گئے۔

اتنے میں ٹرین چل پڑی۔ دو تین سٹیشن گزر گئے۔ رات ہو گئی تھی۔ صوفی

صاحب اپنے ڈبے میں واپس نہ آئے۔ ایک بڑے سٹیشن پر گاڑی کھڑی ہوئی

تو میں نے ابن انشاء سے کہا۔

”میں جا کر صوفی صاحب کا پتہ کرتا ہوں کہ وہاں گئے بھی ہیں کہ

نہیں۔“

وہ ڈبہ کافی آگے تھا۔ میں کئی ڈبے چھوڑ کر اس ڈبے کے پاس پہنچا تو

دیکھا کہ اس کی کھڑکیاں بند تھیں۔ دروازے کی کھڑکی کا پتہ بھی گرا ہوا تھا

اور دروازہ اندر سے بند تھا۔ میں نے دروازے پر زور سے ہاتھ مارا۔ اندر

سے کسی نے آواز دی۔

”کون ہے بھئی؟“

میں نے اپنا نام لیا تو دروازہ کھل گیا۔

”کیا بات ہے؟“ وہ میرا ایک شاعر دوست تھا۔

میں نے پوچھا لیا۔

”صوفی صاحب ادھر آئے تھے۔ کہاں ہیں وہ؟“

شاعر شرر نظروں سے مسکرا رہا تھا۔ کہنے لگا۔

”اندر آ کر دیکھ لو۔“

میں ڈبے کے اندر چلا گیا۔ میں نے دیکھا کہ ناؤ فوش کی محفل گرم ہے

اور صوفی صاحب صدر محفل بنے بیٹھے ہیں اور کسی شاعر کے کلام پر سر ہلا رہا

کر رہا ہے۔ ان کا چہرہ تمہارا رہا تھا۔ مجھ پر نظر پڑی تو اشارے سے

ڈانٹ کر کہا۔

”اوسے دروازہ تو بند کرو۔“

کراچی پہنچ کر ادیب شاعر اپنے اپنے ٹھکانوں پر چلے گئے۔ کسی کو کسی

جگہ ٹھہرایا گیا تھا۔ کوئی اپنے کسی رشتے دار کے ہاں چلا گیا۔ راسخ گلڈ کا

مرکزی اور عارضی دفاتر۔ کیلیٹر ہوٹل میں تھا۔ اشفاق احمد مجھے ملا تو کہنے لگا۔

”تمہارے لئے شباب صاحب نے اسی ہوٹل میں ایک کمرے کا

بندوبست کروا دیا ہے۔“

میں بڑا خوش ہوا۔ کیونکہ اکیلیٹر ہوٹل اس زمانے کے کراچی کے

اعلیٰ ترین اور صاف ستھرے ہوٹلوں میں شمار ہوتا تھا۔ اشفاق مجھے میرے

کمرے میں لے گیا۔ چھوٹا سا مگر بڑا صاف ستھرا کمرہ تھا۔ کہنے لگا۔

”میں شباب صاحب کے پاس ہی ٹھہرا ہوں مگر فکر نہ کرو۔ ہماری

ملاقات ہوتی رہے گی۔ یہاں روز ہی تو آنا ہوگا۔“

گلڈ کے اجلاس خالق دنیا ہال میں منعقد ہوئے تھے سارا دن وہاں رونق

لگی رہتی۔ کراچی کی آبادی بڑی مختصر سی تھی سڑکوں پر کوئی رش نہیں ہوتا

تھا۔ اختتامی اجلاس میں صدر ایوب مہمان خصوصی تھے۔ سارا ہال ادیبوں

شاعروں دانشوروں سے بھرا ہوا تھا۔ اس کے بعد دوسرے چھوٹے چھوٹے

اجلاس شروع ہو گئے۔ میں اور ابن انشاء اکثر ان اجلاس میں سے آگے بھاگ

بھاگ جاتے اور صدر کے علاقے کی سیریں کرتے۔ کبھی میں اکیلا نیچے آکر

ہوٹل کی بار میں بیٹھ بیٹھ جاتا۔

کسی روز شام کو ہم سمندر کی سیر کو نکل جاتے۔ ایک روز ہمارے ساتھ

اشفاق احمد بھی تھا۔ اسے زبردستی ساتھ کھینچا پڑتا تھا۔ اس روز ہم تینوں کلفٹن گئے۔ کراچی کا سمندری ساحل اس زمانے میں بھی بالکل خالی خالی ہوتا تھا۔ ساحل پر کوئی درخت نہیں تھا۔ اب وہاں ناریل کے درخت لگانے کی کوشش ضرور کی گئی ہے مگر یہ تجربہ کامیاب نہیں ہوا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کراچی کی سمندری ہوا جنوب مشرقی سمندروں کی ہوا نہیں ہے۔ مگر سمندر کا جلال دہی ہے جو سمندر کا ہوا کرتا ہے۔ انسان یہ سوچ کر حیران ہوتا ہے کہ اتنے عظیم الشان سمندر کو زمین نے کس طرح اپنی کشش کے جال میں جکڑ رکھا ہے۔ صرف چاند رات کو سمندر کی باجھوت موجیں چاند کو دیکھ کر آپے سے باہر ہو جاتی ہیں اور اچھل اچھل کر چاند کی طرف جانے کی کوشش کرتی ہیں اور یوں ساحل کے قریب ایک علاقہ سارے کا سارا زیر آب آ جاتا ہے۔ اب ساحل کے قریب کراچی کا سمندر بھی آلودہ ہو گیا ہے۔ کراچی کی اپنی فضا بھی آلودہ ہو گئی ہے۔ میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ اس شر کو دشمن کی نظر لگ گئی ہے۔ میں بری نظر کا قائل ہوں۔ بری نظر لگ جاتی ہے بری نظریہ روپ اور امریکہ میں لگ جاتی اگر وہاں بری نظر اور حاسدانہ نظر ڈالنے والے لوگ ہوتے۔ مگر وہاں لوگوں کو بری نظر نہیں لگتی۔ کیونکہ وہاں لوگ دوسرے کو بری نگاہ سے نہیں دیکھتے۔ وہ لوگ بہت کم ہلکے نہ ہونے کے برابر حسد کرتے ہیں۔ زیادہ تر رشک کرتے رہیں اور رشک ایک صحت مند جذبہ ہے۔ حسد میں آدمی دوسرے کے مرجانے کی بددعا کرتا ہے اور رشک میں آدمی اس سے زیادہ ترقی کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

مگر جس زمانے کی میں بات کر رہا ہوں تب کراچی کی فضا بڑی خوبصورت تھی۔ لوگوں کی نگاہیں صحت مند اور پاک تھیں۔ ساحل سمندر پر دور دور سے آنے والی موجوں کی آواز دور تک سنائی دیتی تھی۔ اب کلفٹن سے ذرا الگ ہو جائیں تو سمندر کی آواز رکشوں اور ویکٹوں کے شور میں گم ہو جاتی ہے۔ جس سڑک پر ایکسپریس ہوٹل تھا وہ سڑک شام کو شفق کی روشنی میں

شہری ہو جاتی۔ چونکہ سڑک پر ٹریفک بہت ہی کم ہوتا تھا اس لئے دوسرے سورج کی سرخ روشنی دور تک سڑک پر دکھائی دیتی۔ گلڈ کا عارضی دفتر ہوٹل کی دوسری منزل پر تھا۔ شام کو یہاں پر ہماری خوب محفل لگتی۔ ابن انشاء اور میں تو تقریباً روزانہ ہی وہاں شام کے وقت موجود ہوتے تھے۔ اشفاق احمد بھی وہاں شباب صاحب کے ساتھ آ جاتا۔ پھر محفل کا رنگ کھڑ جاتا۔ وقت مٹا تو میں "ابن انشاء اور اشفاق صدر کے فٹ پاتھ پر گئی پرانی کتابیں دیکھنے نکل جاتے۔ وہاں اردو انگریزی کتابوں کے ڈیرے لگے ہوتے۔ اشفاق اور ابن انشاء وہاں بیٹھ جاتے اور کتابیں الٹ پلٹ کر دیکھتے۔ ایک بار ابن انشاء نے کہا۔

"ایک دن ہماری کتابیں بھی اس طرح فٹ پاتھ پر پڑی ہوں گی۔"

صدر میں ہی کافی ہاؤس بھی تھا۔ وہاں بیٹھ کر کافی پیتے اور کراچی کے ادیبوں اور دانشوروں سے باتیں کرتے۔ کراچی میں ابھی آبادی کا سیلاب نہیں آیا تھا اور چیزیں بڑی خالص مل جاتی تھیں۔ چنانچہ کراچی کے کافی ہاؤس کی کافی بھی بڑی خالص اور تلخ ہوتی تھی۔ یہاں بڑے بڑے لیگنہ روزگار دانشوروں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ جن کی یادیں مجھے آج بھی بڑی عزیز ہیں۔ ہم لوگ تقریباً ایک ہفتہ کراچی میں رہے۔ پھر لاہور واپس آ گئے۔ یہاں آتے ہی راسٹرڈ گلڈ کے انتخابات شروع ہو گئے۔ انتخابات کے ساتھ سیاست بھی گلڈ میں داخل ہو گئی اور سیاست نے فضا کو آلودہ کرنا شروع کر دیا۔ مجھے نہ گلڈ کی سیاست سے کوئی سروکار تھا نہ انتخابات سے کوئی دلچسپی تھی۔ میں الگ ہی رہا۔ ابن انشاء کا دفتر بھی گلڈ کے دفتر کے ایک کمرے میں ہی تھا۔ میں اگر وہاں جاتا تو صرف ابن انشاء سے ملنے کے لئے جاتا۔ یا جب اشفاق وہاں تھا تو دوپہر کے بعد اس سے ملنے چلا جاتا۔ چائے کا دور چلتا۔ خوب باتیں کرتے لطیفے بازی ہوتی۔ تھوڑی دیر کے لئے میں اشفاق احمد کو اوپ کی سیاست سے نکال کر زندگی کے شمال مار باغ میں لے جاتا جہاں آم کے درختوں میں کوئیں بول رہی ہوتیں اور فضاؤں میں آم کی میٹھی خوشبوئیں پھیلی ہوتیں۔

ایک بے تکلف دوستوں کے سوا کسی سے نہیں لکھتا تھا۔ مگر اب وہ بڑا مدبر ہو گیا تھا۔ صرف میں اسے اس خول سے باہر نکالتا تھا۔ افسانے لکھنے اس نے چھوڑ دیئے تھے۔ اب اس کی سازی توجہ ٹیلی ویژن کی طرف ہو گئی تھی۔ ٹیلی ویژن کے لئے وہ بڑے زوردار ڈرامے لکھتا۔ ڈراموں کی سیریل لکھتا۔ وہ ان ڈراموں کو بڑی کاوش اور محنت سے لکھتا تھا۔ ایک بار اس نے ”گمرین کارڈ“ کے نام سے بڑا ڈرامہ لکھا اور پراثر ڈرامہ لکھا۔ میں نے ڈرامہ ٹی وی پر دیکھا تو اس کی سمدار نگاری دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ مجھے ملا تو میں نے اسے کہہ دیا۔ ”تم نے اتنا بڑا موضوع ٹیلی ویژن پر ضائع کر دیا ہے۔ بہتر تھا کہ اس پر تم ایک ناول لکھتے۔“

مگر وہ نہ مانا۔ کہنے لگا۔

”ریڈیو، ٹی وی کا میڈیم بڑا وسیع ہے۔ میں اگر ناول لکھتا تو کتنے لوگ اسے پڑھتے؟ تم بتاؤ۔ زیادہ سے زیادہ چند ہزار آدمی اسے پڑھتے۔ مگر ٹیلی ویژن پر بڑے بڑے کڑواہوں کو آدمیوں نے دیکھا ہے۔ یوں میرا خیال کروڑوں آدمیوں تک پہنچ گیا ہے۔“

مجھے اس وقت بھی اس معاملے میں اشتقاق سے اختلاف تھا اور آج بھی ہے۔ خیر اب تو اشتقاق احمد نے ٹیلی ویژن کے لئے لکھنا بالکل ہی چھوڑ دیا ہے۔ میں اب بھی یہی کہوں گا کہ اس نے ٹیلی ویژن کے لئے لکھ کر اپنی صلاحیتوں کو ضائع کیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ٹی وی پر لاکھوں کروڑوں لوگ دیکھ لیتے ہیں۔ مگر اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔ کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ اگر وہ ان کے افسانے بنا دیتا یا ناول لکھ دیتا تو آج وہ لوگوں کے پاس موجود ہوتے اور لوگ انہیں پڑھ رہے ہوتے۔ مگر اشتقاق کو تو ٹیلی ویژن کے لئے لکھنے کا جنون ہو گیا ہوا تھا۔ میرے خیال کے مطابق اور میری ذاتی رائے میں ٹیلی ویژن اور ٹی وی لکھنے والے راسخوں کے لئے مناسب نہیں ہے۔ چنانچہ دیکھ لیں۔ آج بھی لوگ اشتقاق احمد کے افسانے ”گمراہ“ اور ناول ”مہمان

بہار“ کی بات کرتے ہیں۔ لوگوں کو اس کے افسانے یاد ہیں۔ اس کے ٹیلی ویژن کے ڈرامے لوگ بھول گئے ہیں۔ مگر میں اشتقاق کو نہیں سمجھا سکتا۔ یہ بات اس کی سمجھ میں کبھی آ ہی نہیں سکتی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب اردو ڈائجسٹوں کا دور شروع ہو چکا تھا۔ ان ڈائجسٹوں میں سنسنی خیز جاسوسی کہانیاں، شیر کے شکاریوں کے قصے اور لڑائی مار دھاڑ والے واقعات چھپتے تھے۔ ان رسالوں کا ایک اپنا الگ کمرش مزاج تھا۔ اشتقاق اس مزاج کو نہیں جانتا تھا۔ اس نے ایک ڈائجسٹ میں ”سفرِ سنہ“ کے نام سے اپنا سفر نامہ لکھنا شروع کیا جو خالص ادبی چیز تھی۔ یہ سفر نامہ مجھے خود اس ڈائجسٹ میں اجنبی سا لگا۔ اشتقاق کا خیال تھا کہ وہ کمرشل رسالوں میں ادب کی شمع جلانے لگا۔ مگر وہ ایسا نہ کر سکا۔ یہ ایک ان نیچرل بات تھی اور وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ یہ مانتی تھی کہ گروں میں رسی ڈال کر اسے اپنے گھر میں لانے کی کوشش تھی جس میں اشتقاق ناکام رہا۔

کراچی کے ایک ڈائجسٹ کے ایڈیٹر نے مجھ سے کہا۔

”آپ اشتقاق صاحب سے کہیں کہ وہ ہمارے ڈائجسٹ کے لئے کوئی سلسلہ شروع کریں ہم انہیں معقول معاوضہ دیں گے۔ میں خود ان سے ملا ہوں اور ان کو دعوت دی ہے مگر وہ ٹال مٹال گئے ہیں۔“

میں نے جواب میں کہا۔

”ڈائجسٹ کے لئے لکھنے کے واسطے ایک خاص قسم کا کمرشل مزاج ہونا چاہیے جو اشتقاق کے پاس نہیں ہے۔ ویسے میں اس کو کہہ کر کوئی سیریز آپ کے لئے لکھوانے کی کوشش ضرور کروں گا۔“

میں نے اشتقاق سے بات کی تو وہ بولا۔

”یار! میں ڈائجسٹ کے لئے کیا لکھوں؟“

میں نے کہا۔

”تم ایسا کرو ڈائجسٹ میں سلسلے دار اپنی آپ جی لکھنا شروع کرو۔“

تم مشہور آدمی ہو۔ لوگ تمہارے بارے میں بہت کچھ جاننا چاہتے ہیں۔ لوگ اسے پسند کریں گے۔

اشفاق نے پوچھا۔

”تمہارے خیال میں مجھے کتنے صفحے لکھنے ہوں گے؟“

میں نے کہا۔

”یہ تمہاری آپ بیتی ہوگی۔ تمہیں ڈائجسٹ کے کم از کم پندرہ مہینے صفحے تو ہر بار ضرور لکھنے ہوں گے۔“

”ڈائجسٹ کی لکھائی تو بڑی باریک ہوتی ہے اور سطریں بھی زیادہ ہوتی ہیں۔ تمہارے خیال میں مجھے مسودے کے کتنے صفحے ہر بار لکھنے پڑیں گے؟“

مجھے ڈائجسٹوں کی چھپائی وغیرہ کا اندازہ تھا۔ میں نے اشفاق کے مسودے بھی دیکھے ہوئے تھے کہ وہ کتنی سلیس یا صفحے لکھتا ہے اور ہر صفحے پر کتنی سطریں ہوتی ہیں۔ میں نے تھوڑا سا حساب لگا کر بتایا۔

”تمہیں ہر ماہ کم از کم ساٹھ ستر صفحے لکھنے پڑیں گے۔“

”اف تو یہ۔“ اشفاق گھبرا گیا۔ ”یہ تو پورا مسودہ ہو جائے گا۔ نہیں یاں میں اتنے صفحے کیسے لکھوں گا اور پھر وہ بھی ہر مہینے! اور صرف ڈائجسٹ کے لئے؟“

اشفاق احمد کا ہینڈ رائٹنگ براخوبصورت ہے۔ اس کے لفظ بڑے جم کر کانڈ پر درج ہوتے ہیں۔ جبکہ میرا ہینڈ رائٹنگ کانڈ کے ساتھ بدل جاتا ہے۔ کانڈ کثیر دار ہو تو میری سطریں ٹیڑھی ہو جاتی ہیں۔ قلم یا بال پوائنٹ نیلے رنگ کا ہو تو میری لکھائی بدل جاتی ہے۔ میں صرف سفید کانڈ کالے بال پوائنٹ سے ہی ٹھیک لکھ سکتا ہوں۔ مگر اشفاق کی لکھائی ہر بال پوائنٹ اور ہر قلم اور ہر سیاہی کے ساتھ ٹھیک رہتی ہے۔ ”تلقین شاہ“ کا مسودہ وہ کانڈ کالٹ کر اس کی لمبی لمبی سلیس بنا کر ان پر لکھتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اب بھی وہ ایسا

ی کرتا ہوگا۔ لکھنے میں اس کی ایک عادت یہ بھی ہے کہ وہ اہل زبان والوں کی رد و لکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کی یہ کوشش غیر شعوری ہوتی ہے۔ مثلاً ترکھانوں کے کسی اوزار کے لئے اگر پنجابی کا کوئی لفظ موجود بھی ہو تو وہ اردو کا لفظ ڈھونڈ کر لائے گا چاہے وہ چالو اردو زبان میں استعمال ہوتا ہو یا نہ ہوتا ہو۔ ابن انشاء بھی اپنی نثر میں یہی کیا کرتا ہے۔ مگر ان دونوں کی اردو سادہ اور عام فہم ہوتی ہے۔ جبکہ میں پنجابی میں اردو لکھتا ہوں اور میرے کردار اکثر پنجابی کے الفاظ بول جاتے ہیں۔

لباس کے معاملے میں اشفاق کا معاملہ یہ ہے کہ شروع شروع میں وہ پتلون قمیض استعمال کرتا تھا۔ اس کے بعد اس نے شلوار قمیض کو اپنایا اور آج تک وہی پہن رہا ہے۔ وہ خوش لباس ہرگز نہیں ہے۔ اسے اچھا لباس پہننے کا شوق بھی نہیں ہے۔ وہ اس لئے سادہ لباس نہیں پہنتا کہ ایسا کرنا سادگی اور درویشی کی علامت ہے۔ بلکہ اس کی وجہ ضرورت سے زیادہ اور کجوسی کی حد تک پہنچی ہوئی کفایت شعاری ہے۔ وہ بڑا زبردست کفایت شعار ہے۔ پچھلی سے پچھلی مردوں میں ایک رات میں اس کے گھر گیا تو وہ پرانا سا کالا گرم ہاف کوٹ اور پرانی سی شلوار قمیض پہن کر کمرے میں آیا تو مجھے بالٹاک کا بڑھا گور پو یا آگیا۔

کھانے پینے کے معاملے میں بھی وہ بڑا کفایت شعار ہے۔ نہ سگریٹ پیتا ہے نہ شراب پیتا ہے نہ زیادہ چائے پیتا ہے نہ بوتلوں میں بیٹھ کر قیمتی کھانے کھاتا ہے۔ کبھی پان کھالیتا تھا مگر اب وہ خدا جانے کیا کوٹ کر اس کی پشلی منہ میں ڈال لیتا ہے اور چباتا رہتا ہے اور اس کے قریب بیٹھے ہوں تو کبھی سو ف کی خوشبو آتی ہے۔

اس کے قریب بیٹھے ہوئے مجھے کبھی کسی پرفیوم کی خوشبو نہیں آتی۔ عید کا رُز وہ اکثر اپنے ہاتھ سے بنا کر مجھے پوسٹ کرتا ہے۔ اس معاملے میں وہ بڑا اچھا گھریلو دستکار ہے۔ اسے نوٹو گرانی اور پرنٹنگ کا بھی بڑا شوق ہے۔ کبھی

اس نے ان شیعوں کے متعلق ہر قسم کا سلمان گھر میں لا کر رکھ لیا تھا۔ مگر مجھے بھی کبھی نہیں دکھایا۔ نہ کبھی اس نے میری کوئی تصویر اتاری ہے۔ کبھی بھی میرا بڑا جی چاہتا ہے اور کچھ نہیں تو کم از کم میں اسے سگڑت ہی لگا دوں۔ مگر میں جانتا ہوں کہ اشفاق کی قوت ارادی بڑی مضبوط ہے اور اگر میں نے چالاکی سے کام لے کر اسے سگڑت لگوا بھی دیے تو وہ خود ہی چا کرے گا مجھے ایک سگڑت بھی کبھی نہیں پلائے گا۔ شروع شروع میں وہ ایک آدھ سگڑت پی لیا کرتا تھا۔ کس لگا کر اسی کا دھواں منہ ہی سے باہر پھینک دیتا ہے۔ میرا خیال ہے کسی نے اسے سمجھایا ہوگا کہ اس طرح تو تو اپنی دولت ضائع کر رہا ہے یا تو سگڑت کے دھوئیں کو پیٹ کے اندر لے جاتا کہ کچھ تو پیہ چلے کچھ تو ہمارے پیٹ کے اندر جائے اور اگر صرف کس لگا کر دھواں منہ ہی سے باہر پھینک دیتا ہے تو کیا فائدہ؟ اشفاق نے ایک دن وہ کبھی کبھی کا سگڑت پی لیتا بھی ترک کر دیا۔

میرے ساتھ معاملہ یہ ہے کہ میں یا تو قدم اٹھانے کے بعد سوچتا ہوں یا سوچتا رہتا ہوں اور قدم نہیں اٹھاتا۔ مگر اشفاق ایسا ہرگز نہیں کرتا۔ وہ بڑا سوچ سمجھ کر قدم اٹھاتا ہے۔ بلکہ پھونک پھونک کر قدم اٹھاتا ہے اور اس کی یہ عادت مجھے بڑی پسند ہے۔ آوی کو سوچ سمجھ کر کوئی کام کرنا چاہیے۔ اس طرح آوی بہت سی معیبتوں سے بچ جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اس نے ایک بڑے ہوٹل میں ایک ہی دن میں دونوں میزوں کی شادی کا فرض ادا کر دیا۔ یہ پھونک پھونک کر قدم اٹھانے کا نتیجہ ہے۔

اس نے بازل ٹاؤن میں جو مکان بنایا ہے اس کا ڈرائیونگ روم بڑا صاف ستھرا ہوتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی جو باتھ روم ہے وہ گندا ہوتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں اشفاق احمد کے پاس بڑی دولت ہے مگر میں سمجھتا ہوں کہ لوگ جھوٹ بولتے ہیں۔ میں نے اس کی دولت کی کبھی ایک جھلک تک نہیں دیکھی۔ میں اس کا شاید واحد بے تکلف دوست ہوں۔ لوگ اس پر دولت مند

ہونے کا الزام لگاتے ہیں۔ یا پھر اس کی ناموری سے حسد کرتے ہیں۔ وہ کٹا بول کر ایک اور لائن پر آگیا ہوا ہے۔ یہ تصوف کی لائن ہے۔ مجھے تو اس میں کبھی کوئی تصوف نظر نہیں آیا۔ مگر لوگ کہتے ہیں کہ وہ صوفی ہے۔ میں نے آج تک سارے کشمیری صوفی ہی دیکھے ہیں جن کے دسترخوانوں پر انواع و اقسام کی یا قرقانیاں، اراروٹ، شیرمال اور گٹنا بے اور رش مالو اور گولڈن ہریسے کی چمکتی ڈشیں اور روغنی نان چنے ہوئے ہوتے تھے۔ مثلاً صوفی عجم، امرتسر کے صوفی غلام محمد اور صوفی حمد و کالا۔ کیا خوش خوراک خوش لباس صوفی تھے۔ بکلی کی روشنی یا دھوپ میں آتے تو سرخ و پیید چروں کا روغن چمکنے لگتا تھا۔ لوگوں کو پکڑ پکڑ کر اپنے دسترخوان پر لاتے تھے اور زبردستی کھلاتے تھے اور زردے کا قاب بھر کر بچوں کے لئے ساتھ بھی کر دیتے تھے۔ ہر وقت دعوت کرنے، دیکھیں کھڑکانے کا کوئی نہ کوئی بہانہ تلاش کرتے رہتے تھے۔ ذرا کسی نے کہا۔

”صوفی جی آج موسم بڑا اچھا ہے۔“

صوفی صاحب نے فوراً اعلان کر دیا۔ اٹھاؤ دیکھیں چلو بڑی خبر۔ وہیں روغن جوش کپے گا، زردہ بھی کپے گا، بلغ کی سیر ہوگی۔ میں تو ایسے ہی صوفی حضرات کو جانتا ہوں۔ اگر مجھے کوئی یہ کہے کہ اشفاق احمد صوفی ہو گیا ہے تو بھلا میں کیسے یقین کر سکتا ہوں۔ جیسا وہ اب تک ہے اسے دیکھتے ہوئے میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ صوفی نہیں ہے۔ ہاں! اللہ میاں لگا ہوں اور دلوں کے پھیر دینے والا ہے۔ وہ اگر چاہے تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔

ابن انشاء کی طرح اشفاق احمد کے پاس بھی جو خواتین اس کے افسانوں سے متاثر ہو کر آئیں ان کے ساتھ بڑے ادب و ادب سے گفتگو کرتا اور شرم کے مارے بار بار چہرہ سرخ ہو جاتا۔ وہ جب کسی لڑکی کو بزرگ بن کر ”کڑے“ کہتا تو بعد میں میں اس کی سخت سرزنش کرتا کہ یہ تم لڑکیوں کے آگے بزرگ کیوں بن جاتے ہو؟ کیوں اپنا مستقبل تاریک کر رہے ہو؟ مگر جیسا کہ

میں پہلے آپ کو بتا چکا ہوں اشفاق احمد لمبا " شریف آدمی ہے۔ کئی رومان اس کے پاس آئے اور اسے ہاتھ لگا کر آگے کل گئے۔ اشفاق احمد کی شخصیت اور اس کی باتوں میں ایسا اثر ہے کہ لوگ بہت جلد اس کے گردیدہ ہو جاتے ہیں۔ یہ خدا داد صلاحیت ہوتی ہے۔

ہر دور میں اس کی شخصیت کے مدار کے گرد دو چار سیارے ضرور گردش کرتے رہے ہیں۔ ان میں سے بعض سیاروں نے اس سے منحرف ہو کر اپنا راستہ تبدیل کر لیا ہے اور بعض آج بھی جھول کھا کھا کر کئی نہ کسی طرح گردش کئے جا رہے ہیں۔ ایسا ضرور ہوا ہے کہ جو بھی اس کی شخصیت سے متاثر ہو کر اس کے قریب آیا کچھ عرصہ گزر جانے کے بعد اندر سے اس کا مخالف بن گیا۔ شروع شروع میں اشفاق احمد کے حلقہ اثر میں جو لوگ بیٹھا کرتے تھے وہ اس کے افسانوں اور اس کے فن کی ضرورت باتیں کرتے تھے۔ مگر بعد میں جو لوگ اس کے قریب آئے ان کے منہ سے مین نے اشفاق کے افسانوں اور اس کے افسانوی کرداروں کی کبھی کوئی بات نہیں سنی۔ کچھ لوگ اس لئے بھی اشفاق احمد کے قریب آ جاتے تھے کہ اشفاق کی بڑے بڑے سرکاری اور غیر سرکاری افسروں سے ملاقات تھی اور وہ اشفاق کی مدد سے اپنا کوئی نہ کوئی کام نکلوانا چاہتے تھے۔ دوسروں کے کام آنے کے معاملے میں اشفاق احمد بے حد احتیاط سے کام لیتا ہے۔ بڑی زیرکی اور معاملہ فہمی کے ساتھ مسئلے کے سارے پہلوؤں پر غور کرتا ہے وہ کام کر دیتا ہے مگر غور کرنے پر بہت وقت لگاتا ہے۔

اس کا افسانہ "گھڑیا" اس کے دل کی ترجمانی کرتا ہے۔ میں جب اس افسانے پر ہاتھ رکھتا ہوں تو مجھے صفحے کے اندر اس کے دل کی ہلکی ہلکی دھڑکن محسوس ہوتی ہے۔ اشفاق احمد کے اندر ایک درخت بھی اگا ہوا ہے۔ یہ درخت وہ اپنے آبائی گاؤں گڑھ کستور سے اپنے ساتھ لایا ہے۔ اس درخت پر چڑیاں بیٹھتی ہیں۔ طوطے بولتے ہیں۔ خزاں میں اسی درخت کے پتے زرد ہو

کر جھڑ جاتے ہیں اور بہار میں اس کی شاخوں پر گلابی اور نسواری نازک نازک وینٹیں پھوٹتی ہیں۔ اس درخت پر ایک بلبل آکر بیٹھا کرتی تھی۔ اشفاق نے گھڑے اس کا کبھی ذکر نہیں کیا تھا۔ کسی وقت میں بلبل کی اداس آواز سنتا تو اشفاق سے اس کے بارے میں سوال کرتا۔ وہ ہنس کر نال دیتا۔ میں اصرار کرتا تو وہ کہتا۔

"میرے درخت کی شاخ پر کوئی بلبل کہاں سے آکر بیٹھے گی۔ تم نے لارنس باغ سے آئی کسی بلبل کی آواز سنی ہوگی۔"

یہ اس زمانے کی بات ہے جب اشفاق احمد کا رسالہ "داستان گو" نیا نیا شائع ہونا شروع ہوا تھا۔ اسے اٹلی سے رسالے آتے تھے۔ جن میں سے وہ کوئی مضمون ترجمہ کر کے چھاپ دیتا یا کوئی کارٹون یا لطیفہ نقل کر لیتا۔ میں دیکھا کرتا تھا کہ وہ خالی وقت میں "داستان گو" کے دفتری میز پر بیٹھا کافٹر پر انگریزی میں ایم آر کے لفظ شکستہ انداز میں لکھتا تھا۔ جیسے کسی کے دستخط کی نقل اتارنے کی کوشش کر رہا ہو۔ ایک دن میں نے اس سے پوچھا کہ وہ کس کے دستخط کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اشفاق ہنس دیا۔

"قلم چالو کرنے کے لئے ویسے ہی ایم آر لکھ دیتا ہوں۔ یہ کسی کے دستخط نہیں ہیں۔"

مگر وہ ایک اطالوی لڑکی ماریا کے نام کے مختصر دستخط تھے۔ اس اطالوی لڑکی کے متعلق اشفاق احمد نے مجھ سے کبھی کوئی بات نہیں کی تھی۔

ایک دن کی بات ہے۔ میں "داستان گو" کے دفتر میں اس کے پاس بیٹھا چائے پی رہا تھا اور نیچے مال روڈ کی مختصر ٹریفک کو دیکھ رہا تھا۔ ریگل والے بس سٹاپ پر بس آکر روکتی تو اس میں سے دو چار آدمی اتر جاتے۔ ایک دوسواریاں چڑھ جاتیں۔ بس آگے روانہ ہو جاتی۔ اومٹی بس کی گاڑیاں ابھی بہت صاف ستھری تھیں اور ان کا رنگ روغن بھی ابھی قائم تھا۔ سڑیوں کا موسم تھا۔ بڑی چمکیلی دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ میں اشفاق کی میز کے پہلو میں کرسی پر بیٹھا

اشفاق احمد کرسی کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے سے لگتا تھا کہ اس کے دل میں کئی قسم کے خیالات آتے ہیں اور گزر جاتے ہیں۔ عجیب و غریب کیفیات کی اداس لہریں اس لمحے بھی اس کے دل کو چھو کر گزر رہی تھیں۔ جس طرح سمندر کی لہریں دور دور سے آکر ساحل کو چھوتی ہیں اور واپس چلی جاتی ہیں۔ کہنے لگا۔

”میں نے تمہیں کہا نا! ماریسا پر مشرقی اخلاقی روایات کا بڑا گہرا اثر تھا۔ ہم نے ایک مدت روم اور فلورنس میں ایک ساتھ سیر و سیاحت کرتے رہے۔ دستور انوں میں چائے پیتے، آرٹ گیلریوں میں اٹلی کے نامور مصوروں کی تصویریں دیکھتے گزارے۔ موسم خوشگوار ہوتا تو کسی پارک میں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے درختوں کے نیچے سیر کرتے یا پھر کسی بیچ پر بیٹھ جاتے۔ میں ماریسا کو پاکستان کے بارے میں جتنا کہ ماریسا بڑے غور سے میری باتیں سنتی۔ اپنے بارے میں اس نے مجھے بس اتنا ہی بتایا تھا کہ اس کے ماں باپ بچپن ہی میں فوت ہو گئے۔ اس کا ایک بھائی تھا جس کو تصویریں بنانے کا شوق تھا۔ وہ فرانس کے کسی گاؤں میں مقیم تھا اور کبھی کبھار کرسمس کے موقع پر ماریسا کو ایک کرسمس کارڈ بھیج دیتا تھا۔“

”ماریسا تمہاری یونیورسٹی میں پڑھاتی تھی کیا؟“

”نہیں۔“ اشفاق نے کان کھجاتے ہوئے کہا۔

”وہ روما کی ایک کتابوں کی دکان پر جاب کرتی تھی۔ جب میں روما سے واپس وطن روانہ ہوا تو وہ اسی دکان پر ملازم تھی۔ وہ مجھے ایئر پورٹ پر چھوڑنے آئی تھی۔ مجھے الوداع کہتے ہوئے بالکل مشرق لڑکیوں کی طرح اس کی آنکھوں میں آنسو چھٹک آئے تھے۔“

”تمہاری پہلی ملاقات کہاں ہوئی تھی؟“

میرے اس سوال پر اشفاق نے چائے کی خالی پیالی کو پرے کھینکا

ہوئے کہا۔

”یار! یہ بڑی لمبی رام کہانی ہے۔ پھر کبھی سنائوں گا۔“

میں یہ رام کہانی ضرور سننا چاہتا تھا۔ ان دنوں ہماری تقریباً روز ہی ملاقات ہوتی تھی۔ چنانچہ ایک روز میں نے اشفاق کو قایم کر لیا۔ مجھے یاد ہے جنوری و ستمبر کے دن تھے۔ بڑی سردی پڑ رہی تھی۔ اس زمانے میں لاہور میں بڑی سخت سردی پڑا کرتی تھی۔ جنوری میں تو بارشیں ضرور ہوتی تھیں۔ جس کی وجہ سے سردی بڑھ جاتی۔ اس روز بھی کافی سردی تھی۔ ایک روز پہلے بارش ہوئی تھی۔ لارڈز ریسٹوران کے اوپر جو شاہ نشین ڈسپ کی گیلری ہوا کرتی تھی ہم وہاں آکر بیٹھ گئے۔ میرا خیال ہے کہ اشفاق احمد کی زندگی کا یہ سب سے خوبصورت اور معصوم رومان ہے جس نے اس کی تحریر اور اسلوب پر گہرا اثر ڈالا۔ اگرچہ اس نے اپنے رومانس کو درحدیث دیگران ہی بیان کیا ہے۔ میں نے چائے منگوائی۔ چائے آنے تک ہم اوپر اوپر کی باتیں کرتے رہے۔ چائے آئی تو اشفاق نے اپنے قیام روما کی یادوں کا سلسلہ چھیڑ دیا۔ کہنے لگا۔

”روما میں میرا زیادہ وقت یونیورسٹی میں گزر جاتا تھا۔ میں اٹالوی سٹوڈنٹس کو اردو پڑھاتا تھا۔ چونکہ میں نے اٹالوی زبان سیکھ لی تھی اس لئے سٹوڈنٹس کو اردو سیکھانے میں بڑی آسانی ہو گئی تھی۔ یونیورسٹی میں مجھے سر پر کا وقت ہو جاتا تھا۔ دوپہر کا کھانا میں یونیورسٹی کے کیفے ٹیریا میں ہی کھاتا۔ جس بلڈنگ میں میرا فلیٹ تھا وہ یونیورسٹی کیمپس سے زیادہ دور نہیں تھی۔ میرے پاس ایک ہی کمرہ تھا جس کے کونے میں بیڈ لگا تھا۔ ساتھ ہی ہاتھ روم تھا۔ کھڑکی عمارت کی کچھیں طرف ایک چھوٹی سڑک پر کھلتی تھی۔ یہ سڑک چھوٹے چھوٹے گول پتھر جوڑ کر بنائی گئی تھی ذرا آگے جا کر یہ فلیٹ میں اتر جاتی تھی۔ اس کی دونوں جانب پرانے زمانے کے رہائشی فلیٹ تھے۔ یہاں اٹالوی عورتوں نے گیلریوں میں پھول دار گیلے سجائے ہوئے تھے۔ یہ ایک گلی

ہی تھی۔ اطالوی عورتیں بہت زیادہ باتیں کرتی ہیں۔ وہ گیلریوں میں آکر بیٹھ جائیں اور آپس میں اونچی آواز میں باتیں کرنے لگیں۔ میں کھڑکی بند بھی کرتا تب بھی مجھے ان کی آوازیں آتی رہتی تھیں۔ گلی میں مکانوں کے درمیان تاروں پر گیلے کپڑے سکھانے کے لئے ڈال دیئے جاتے تھے۔ ہوا چلتی تو یہ کپڑے خوب جھولے جھولتے۔

اس گلی کے آگے ایک کھلا چوراہا تھا جہاں تین اطراف میں قدیم رومن بادشاہوں کے زمانے کی تاریخی عمارتیں تھیں۔ ایک کشادہ سڑک ان کے درمیان سے گزر کر شہر کے مشہور دریا ٹامیر کی طرف نکل جاتی تھی۔ اس دریا نے تاریخ کے کئی دور دیکھے ہیں۔ دریا کے کنارے اونچے اونچے درخت ہیں جن کی سایہ دار روشوں پر شام کے وقت لوگ چل قدمی کرنے آجاتے ہیں۔ دریا کو ایک پرانے پل پر سے پار کریں تو آگے بائیں ہاتھ کو ایک خوشنما پارک آجاتا ہے اور دائیں ہاتھ کو ایک سڑک خلیب میں سے ہوتی ہوئی شہر کے پرانے اور عجیب علاقے کی طرف جاتی ہے۔ اسی سڑک کے ایک چوک میں کتابوں کی وہ دکان تھی جہاں ماریا ملازم تھی۔ میں نے پہلی مرتبہ ماریا کو اسی دکان میں دیکھا۔ ماریا عام اطالوی لڑکیوں کی طرح شوخ اور نمائش پسند نہیں تھی۔ جسم دہلا پٹلا تھا۔ بالوں کی مانگ ہماری مشرقی عورتوں کی طرح درمیان میں سے نکالتی اور بالوں کا پیچھے جوڑا بنالیتی تھی۔ آنکھوں میں ایک اداسی تھی۔ یا مجھے اس کی آنکھیں اداس لگتی تھیں۔ میں اس جذبے کا پورا تجزیہ نہیں کر سکا۔ میں ایک ماڈرن اطالوی رسالے کی تلاش میں اس کی دکان میں گیا تو پہلے ہی کاؤنٹر پر ماریا نے مسکراتے ہوئے ایک خوش اخلاق دکاندار کی طرح میرا استقبال کیا اور اطالوی زبان میں مجھ سے کہا۔

”میں آپ کی کیا مدد کر سکتی ہوں؟“

میری گوری رنگت اور وضع قطع سے اس نے مجھے اطالوی سمجھا تھا۔

جب میں نے اطالوی زبان میں ہی اس سے بات کی تو اس نے یوں پر ہلکی سی

مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف دیکھا اور کہا۔

”سینورا! تم اطالوی نہیں لگتے۔ کیا تم ہسپانوی ہو؟“

میں نے جتے ہوئے کہا۔

”میں پاکستانی ہوں۔ پاکستان سے آیا ہوں اور یہاں یونیورسٹی میں

اردو پڑھاتا ہوں۔ اردو ہماری قومی زبان کا نام ہے۔“

ماریا نے گردن کو ذرا سا جھکا کر جیسے میری تعظیم کی اور مجھ سے پوچھا کہ مجھے کیا چاہیے۔ میں نے اطالوی رسالے کا نام لے کر کہا کہ یہ رسالہ مارکیٹ میں کہیں نہیں مل رہا۔ مجھے اس کی ضرورت ہے۔ ماریا کی نگاہیں کاؤنٹر پر اور کاؤنٹر کے پیچھے لٹکے ہوئے رسالوں کا جائزہ لے رہی تھیں۔ سر کو نفی میں ہلاتے ہوئے اس نے میری طرف دیکھا۔ مسکرائی اور معذرت کرتے ہوئے کہا۔

”سینورا! یہ رسالہ ہمارے ہاں بھی آتے ہی ختم ہو گیا ہے۔ میں

کوشش کروں گی کہ آپ کو رسالہ مل جائے۔ کیا آپ کل اسی

وقت آ سکتے ہیں؟ اگر آپ پسند کریں تو میں آپ کو یونیورسٹی پہنچا

دوں۔ ہمارا آدمی دن میں ایک بار یونیورسٹی کا چکر لگاتا ہے۔“

تم تو جانتے ہی ہو میں آرام طلب قسم کا آدمی ہوں۔ میں نے اسے اپنا کارڈ دیا اور کہا کہ مجھے یہاں رسالہ پہنچا دیا جائے۔ ماریا نے کارڈ لے کر رکھ لیا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور دکان سے باہر نکل آیا۔ ماریا ایک دوسرے جاگ سے باتیں کرنے لگی۔ دریا کے پل تک آتے آتے ماریا کا خیال میرے دماغ سے نکل گیا تھا۔

دو سرے دن میں یونیورسٹی گیا تو میری میز پر وہ اطالوی رسالہ پڑا تھا جس کی مجھے تلاش تھی۔ میرے ساتھی پروفیسر نے بتایا کہ پرائما بکس کی دکان سے ایک لڑکا آکر دے گیا ہے۔ پرائما پرائما بکس اس دکان کا نام تھا جہاں ماریا ملازم تھی۔ میں نے بڑے شوق سے رسالہ کھولا۔ رسالے کے پہلے صفحے پر زرد کلفٹن کی چھوٹی سی چٹ گئی تھی جس پر اطالوی زبان میں لکھا تھا۔

”سینورا! رسالے کی قیمت میں نے ادا کر دی ہے۔“

بچے ماریا جوتا لکھا تھا۔ یہ ماریا کا پورا نام تھا۔

میں نے اسی وقت ڈائریکٹری میں سے پرائما بکس کا نمبر نکال کر ماریا کو فون کیا۔ میں اس کا شکریہ بھی ادا کرتا چاہتا تھا اور اس رسالے کی قیمت بھی ادا کرنا چاہتا تھا۔ فون ماریا نے ہی اٹھلایا۔ میں نے ماریا کو اپنا نام بتایا اور رسالے کا شکریہ ادا کرنے کے بعد کہا۔

”میں رسالے کی قیمت ادا کرنے دوپہر کے بعد آؤں گا۔“

ماریا کہنے لگی۔

”سینورا! دکان پر ضرور آئیں۔ مگر قیمت ادا کرنے کی ضرورت

نہیں۔ وہ تو میں ادا کر چکی ہوں۔“

میں نے کہا۔

”مگر میں تم پر یہ بوجھ کیوں ڈالوں؟“

ماریا کی آواز آئی۔

”سینورا! تم ہمارے پاکستانی مسلمان ہو۔ اس وعدہ تو میں رسالے کے

پیسے نہیں لوں گی۔ یہ میری طرف سے تمہیں گفٹ ہے۔“

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ اس نے فون بند کر دیا۔ جانے کیوں اس لمحے میرے دل میں آرزو پیدا ہوئی کہ ماریا کو اتنی جلدی ٹیلی فون بند نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اسے چاہیے تھا کہ وہ مجھ سے مزید باتیں کرتی۔ میں زیادہ دیر تک اس کی آواز سنتا۔ خدا جانے میرے دل میں یہ خواہش کیوں پیدا ہوئی تھی۔ حالانکہ مجھے ماریا سے محبت وغیرہ بالکل نہیں تھی۔ اس قسم کا خیال بھی میرے دل میں کبھی نہیں آیا تھا۔ میں نے اس آرزو کو ذہن سے جھٹک کر نکال دیا اور رسالے کا مطالعہ کرنے لگا۔ میں نے ماریا سے کہا تھا کہ میں رسالے کی قیمت ادا کرنے دوپہر کے بعد اس کی دکان پر آؤں گا۔ مگر اب اس کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ کیونکہ ماریا نے قیمت ادا کر دی تھی اور مجھ سے پیسے لینے سے انکار کر دیا تھا لیکن جب دوپہر کو میں کیفے ٹیریا میں کھانا کھانے کے بعد یونیورسٹی کے وسیع و عریض باغ کی ایک دوش پر سا پرسی کے درخت کے نیچے بیٹھ کر بیٹھا سستا رہا تھا تو میرے کانوں میں ماریا کی آواز آئی۔

”سینورا! دکان پر آپ ضرور آئیں مگر قیمت ادا کرنے کی ضرورت

نہیں۔“

مجھے بے اختیار حبیب جالب کی غزل کا ایک مصرع یاد آ گیا۔

پھر دل سے آ رہی ہے صدا اس گلی میں چل

میں اس وقت کی اپنی جذباتی کیفیت پر ہنس دیا۔ ایسی بات نہیں ہے کہ میرا دل محبت کے جذبات سے خالی تھا۔ ایک دو بار میں اس گلی میں سے گزر چکا تھا لیکن اصل بات یہ ہے کہ میرے دل پر میرے ذہن کا غلبہ ہے۔ میرے دل کی باگ ہمیشہ میرے دماغ کے ہاتھوں میں رہتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بری بات نہیں ہے۔ یہ اچھی بات ہے۔ کم از کم میرے لئے یہی بات اچھی ہے۔ میں نے ماریا کے پاس جانے کا خیال دل سے نکال دیا اور آنکھیں بند کر کے لاہور میں اپنے گھر کے بارے میں سوچنے لگا۔

ایک جیٹ ہوئی جہاز شور مچاتا میرے اوپر سے گزر گیا۔ اس کے شور سے میرے تصورات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ میں اٹھا اور واپس یونیورسٹی کی طرف چل پڑا۔ ابھی میرا ایک لیکچر رہتا تھا۔ لیکچر ختم کیا تو دوسرے کے ذہانی بج رہے تھے۔ میں نے رسالہ بریف کیس میں رکھا اور یہ سوچ کر اپنے فلیٹ کی طرف روانہ ہو گیا کہ وہاں جا کر اطمینان سے اپنی پسند کا مضمون پڑھوں گا۔ فلیٹ میں آکر میں نے کافی بنا کر کمپنگ کے پاس تپائی پر رکھا اور لیٹ کر رسالہ پڑھنے لگا۔ پیچھے جو گلی تھی وہاں سے دو اطالوی عورتوں کی اونچی آواز میں باتیں کرنے کی آواز آرہی تھی۔ ایک عورت نے قہقہہ لگایا۔ اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ لٹا خاموش ہوئی تو میرے کانوں میں ماریا کی آواز آئی۔ یہ آواز اس بار سرگوشی میں تھی جیسے وہ بڑے رازدارانہ انداز میں کہہ رہی تھی۔

”دوسرے کے بعد ضرور سنا۔ میں انتظار کروں گی۔“

میں نے کافی کا گھونٹ پیا۔ تک تپائی پر رکھا۔ رسالہ بند کر کے بستر پر پھینکا اور اٹھ کر سیدھا غسل خانے میں گھس گیا۔ منہ ہاتھ دھو کر بالوں کو اچھی طرح سے سنوارا۔ دوسرے کپڑے پہنے۔ فلیٹ کا دروازہ لاک کیا اور میڑھیاں اتر کر نیچے سڑک پر آگیا۔

میرے قدم اپنے آپ قدم رومن عمارتوں والے چوک کی طرف اٹھ رہے تھے۔ چوک میں ٹریفک جاری تھی۔ مگر یہ چوک اتنا بڑا تھا کہ میں چلتی ٹریفک میں بھی بڑی آسانی سے چوک عبور کر کے ڈاؤن ٹاؤن کو جاتی سڑک پر نکل آیا۔ یہاں سے سڑک کا نشیب شروع ہو جاتا تھا۔ چوک کے کونے پر ایک چھوٹا سا بورڈ باہر کو لٹکا ہوا تھا جس پر انگریزی میں پراگماتیکس لکھا تھا۔ اس دکان کے قریب پہنچا تو مجھے محسوس ہوا کہ میرے دل کی دھڑکیں کچھ تیز ہو گئی ہیں۔

چھوٹے چھوٹے پتھروں کے بنے ہوئے فلٹ پاتھ پر چلتے چلتے میں بینکوں کی دکان کے شوکیں کے ساتھ لگ کر رک گیا۔ میں نے اپنے دل کی دھڑکن کا

جائزہ لیا۔ دل کی دھڑکن معمول پر آگئی تھی۔ مگر میرا دل زور زور سے کیوں دھڑکنے لگا تھا؟ میں نے سوچا۔ اس خیال پر کہ کہیں مجھے ماریا سے محبت تو نہیں ہوگئی۔ مجھے ہنسی آگئی۔ میں نے اپنے جذبات اور ذہنی کیفیات کا جائزہ لیا تو میں اس نتیجے پر پہنچا کہ میرے دل کے ایکدم تیز تیز دھڑکنے کی وجہ محبت نہیں بلکہ ایک قسم کا خوف تھا یا کسی خوف کا احساس تھا۔ میں نے فوراً دل کو اپنے دماغ کے حوالے کر دیا اور ماریا کی دکان کی طرف تیز تیز قدموں سے چلنے لگا۔

ماریا نے مجھے دکان میں داخل ہوتے دیکھ لیا تھا۔ وہ کاؤنٹر پر کسی کے ساتھ ٹیلی فون پر بات کر رہی تھی۔ میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے اپنے سر کو ذرا سا جھکا دیا۔ جب میں اس کے کاؤنٹر پر پہنچا تو وہ اس دوران ٹیلی فون بند کر چکی تھی۔ ہنس کر کہنے لگی۔

”سینور! پلیز مجھ سے رسالے کی قیمت کی بات نہ کرنا۔“

میں نے اپنے دل کا جائزہ لیا۔ سب خیریت تھی، دل معمول کے مطابق دھڑک رہا تھا۔ بس اسی طرح دھڑکتے رہنا۔ میں نے اپنے دل کو حکم دیا۔ میں کوئی رائیجھا یا بھون نہیں ہوں۔ میں نے جیب سے بیوہ نکالا کہ رسالے کے پیسے کم از کم پیش ہی کر دوں۔ یہ میرا اخلاقی فرض بھی تھا۔ ابھی میں بیوہ کھول ہی رہا تھا کہ ماریا نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ ماریا کا ہاتھ گرم تھا۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ میرا ہاتھ ٹھنڈا تھا۔ ایک دم سے مجھے خیال آیا کہ ماریا نے کہیں یہ نہ سوچا ہو کہ روایتی عاشقوں کی طرح اس کے سامنے آنے سے میرے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے ہیں۔ میں نے ہاتھ کھینچ لیا اور کہا۔

”آج سردی ہے۔“

حالانکہ اس روز موسم خوشگوار تھا اور رات بھر جو ٹھنڈی ہوا چلتی رہی تھی اس کا زور ختم ہو چکا تھا۔ پھر میں فوراً اصل موضوع پر آگیا۔

”نہیں نہیں سینور! ماریا! یہ پیسے رکھ لو۔ میں تم پر بوجھ نہیں ڈالنا

چاہتا۔

مارسیا کا چہرہ سنجیدہ ہو گیا۔ وہ کاؤنٹر پر بے ترتیبی سے پڑی کتابوں کو ترتیب سے رکھ رہی تھی۔ اس نے گردن موڑ کر پھری طرف دیکھا اور بولی۔
”سینورا! میں رسالے کی قیمت وصول نہ کرنے کا فیصلہ کر چکی

ہوں۔“

اور وہ کتابوں کو سینے میں مصروف ہو گئی۔ میں کچھ کھینچا سا ہو کر مسکرائے اور ہاتھوں کو زور زور سے رگڑنے لگا۔

”تھینک یو تھینک یو سینورنا۔“

اس کے بعد مارسیا نے میری طرف توجہ نہ دی۔ وہ ایک خاتون سے باتیں کر رہی تھی۔ پھر اس کو شیفت میں سے کتابیں نکال کر دکھانے لگی۔ میں چپکے سے وہاں سے چل دیا۔ اپنے فلیٹ تک میں یہی سوچ سوچ کر دل میں شرمسار سا ہوتا رہا کہ میں نے مارسیا کے ساتھ ضرورت سے زیادہ تکلف کیوں کیا؟ مجھے اس سے ملنے کا کوئی بہانہ چاہیے تھا تو یہ کہہ رہا کہ ادھر سے گزر رہا تھا۔ سوچا تمہارا شکریہ ادا کرنا چلوں۔ مگر تم جانتے ہو کہ ہم لوگ کچھ زیادہ ہی جھوٹ بولتے ہیں۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ہمارا جھوٹا رکھ رکھاؤ اور تکلفات جھوٹ کی سرحدوں میں داخل ہو جاتے ہیں۔ اب مجھے ایک پچھتاوا سا لگ گیا۔ ضمیر میں ایک غلط سی جھینے لگی۔ بار بار یہ خیال آتا کہ مارسیا پر میرا اثر کچھ اچھا نہیں پڑا۔ وہ میرے بارے میں ’پاکستانیوں کے بارے میں کیا سوچتی ہوگی۔ کہ پاکستانی اس قسم کے بنیادی لوگ ہوتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ میں نے رسالے کی قیمت ادا کرنے کے لئے یونہی بڑھ کھول دیا تھا۔ اصل میں مجھے معلوم تھا کہ مارسیا رقم نہیں لے گی اور میں رقم ادا بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یہ میری منافقت تھی یا اسے تم پوچھ کر کہہ سکتے ہو۔ یہ پوچھ کر ہی ہمارے پاکستانی معاشرے کی رگوں میں دوڑتی پھر رہی ہے۔ ہم روز اس قسم کی حرکتیں کرتے ہیں اور کبھی دل میں غلطی تک محسوس نہیں کرتے۔ مگر مارسیا ایک صاف

نواف ضمیر والی لڑکی تھی اس کے آگے میں نے ایسی حرکت کی تو مجھے اس پر کرسی کا زیادہ احساس ہوا اور میرے ضمیر نے بھی ہلکی سی ملامت کی۔

میرے دل میں ابھی تک مارسیا کے لئے محبت و غیور کے جذبات پیدا نہیں ہوئے تھے۔ بس میں اپنے ضمیر کی غلطی مٹانے اور اس کے دل میں ’پاکستانیوں کے بارے میں جو تاثر پیدا ہو چکا تھا اسے دور کرنے کے لئے ملنا چاہتا تھا۔

مجھے بہت جلد ایک سنہری موقع مل گیا۔ ایک ہفتے بعد یوم پاکستان تھا۔ بس نے یونیورسٹی کے کیفے ٹیریا میں اس قومی تقریب کو منانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس تقریب میں روم یونیورسٹی کے پروفیسروں اور میرے چند ایک پاکستانی دوستوں اور ان کی فیملیوں نے شرکت کی۔ مارسیا کو میں نے خاص طور پر خود بلا کر دعوت دی۔ وہ بڑی خوش ہوئی۔ کہنے لگی۔

”پروفیسور! میں ضرور آؤں گی۔“

تقریب سادہ مگر بڑی پرزور تھی۔ روم میں مقیم میرے دوست اور ان کے بیوی بچے خاص پاکستانی لباس پہن کر آئے تھے۔ کچھ خواتین سندھی لباس میں ملیوس تھیں۔ کچھ نے پنجابی اور پنجابی لباس پہن رکھا تھا اور کچھ بلوچی عورتوں کے روایتی لباس میں تھیں۔ میرے کچھ دوست بھی سندھی ’پنجابی‘ پنجابی اور بلوچی لباس میں آئے تھے۔ پاکستان کے ملی گیت بچوں نے مل کر گائے۔ میں نے پاکستان کے قیام کی اہمیت اور اس کے سیاسی پس منظر پر ایک تقریر کی۔ یہ تقریر اطالوی زبان میں کی تاکہ وہاں کے دانشور پوری طرح سمجھ جائیں کہ پاکستان کا قیام کیوں ضروری تھا۔ کیفے ٹیریا میں قائد اعظم کی ایک تصویر میں نے اپنے ایک دوست کے گھر سے منگوا کر لگا رکھی تھی۔

مارسیا اس تقریب سے بڑی متاثر ہوئی۔ پاکستان کے مختلف صوبوں کے کھریل لباسوں اور پاکستانی خواتین نے بھی اسے بڑا متاثر کیا۔ مجھے کہنے لگی۔

”سینورا! —

میں نے اس کی بات کاٹے ہوئے کہا۔
 ”مارسیا! تم مجھے پرونے سو کرنا کرو۔ تمہارے منہ سے مجھے یہ لفظ
 اچھا لگتا ہے۔“
 وہ ہنسنے لگی۔

”ہاں تو پرو نیسور! پاکستان بڑا کٹر فل ملک ہے۔ تمہارے ملک کی
 خواتین بڑی خوبصورت اور خوش اخلاق ہیں۔“
 ”اور پاکستانی مردوں کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟“

میں نے شرارتی انداز میں مسکراتے ہوئے پوچھا۔ مارسیا نے ہلکا سا
 قہقہہ لگا کر کہا۔

”پاکستانی اپنے ملک سے بڑی محبت کرتے ہیں۔ اس لئے مجھے بہت
 اچھے لگتے ہیں۔ جن لوگوں کو اپنے ملک سے محبت نہیں ہوتی۔ ان
 پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔“

اس کے ہاتھ میں ٹھنڈے کوکا کولا کا گلاس تھا۔ ہم باتیں کرتے اونچی
 محراب دار کھڑکی کے پاس آ گئے۔ مارسیا کھڑکی کے شیشے میں سے باہر دیکھ رہی
 تھی۔ دور عمارتوں کے پیچھے سینٹ ہال کے گرجے کا گنبد کا اوپر کا حصہ نظر آ
 رہا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی۔

”یہ شہر کبھی ایک ملک تھا۔ یہ ملک میرا اور میرے اجداد کا ملک
 ہے۔ آج سے سینکڑوں برس پہلے میرے آباؤ اجداد یہاں آئے
 تھے۔ اس وقت یہاں لومبارڈوں کی حکومت تھی۔ روما کی سلطنت
 مقدس سلطنت تھی۔ اس زمانے میں یہ سلطنت مذہب اور سیاست
 میں تقسیم ہو گئی۔ یہ دونوں طاقتیں اپنی اپنی جگہ پر بڑی مضبوط
 تھیں۔ یہ خانہ جنگیوں کا دور تھا۔“

مارسیا نے میری طرف دیکھا اور بولی۔
 ”خانہ جنگی بعض ملکوں کی قسمت میں لکھ دی گئی ہے۔ ایسے ملکوں

میں میرے ملک کا بھی ایک صدی پہلے تک یہی حال تھا۔“
 یونیورسٹی کا فیکس کا اٹلاوی پروفیسر آر تھرو ورک ہمارے پاس مسکراتے
 ہوا آیا۔ وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔

”پرو نیسور! اشتقاق! میں ایک بار پھر تمہیں تمہارے ملک پاکستان کے
 یوم آزادی پر مبارک باد دیتا ہوں۔ تمہارا قائد اعظم ایک گریٹ
 لیڈر تھا اور تمہاری قوم۔“

وہ ایک لمحے کے لئے چپ ہو گیا۔ جیسے اسے الفاظ نہ مل رہے ہوں۔
 پھر جنگی بجا کر انگلی کا اشارہ میری طرف کر کے بولا۔
 ”تمہاری قوم مارشل قوم ہے۔ تم قدیم رومن قوم کی طرح بہادر
 قوم ہو۔“

وہ مارسیا کی طرف دیکھنے لگا۔ جیسے اس سے تعارف چاہتا ہو۔ میں نے
 مارسیا کا تعارف کرایا تو اس نے بڑی گرجوشی کے ساتھ مارسیا سے ہاتھ ملایا اور
 بولا۔

”تمہاری دکان پر گھیلو گھیلو پر لکھی ہوئی ویٹرو پینٹانی کی کتاب تو
 ضرور ہوگی۔“
 مارسیا نے کہا۔

”میرا خیال ہے ضرور ہوگی۔“
 ”اوکے۔“ پروفیسر نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”میں کسی روز ضرور
 آؤں گا۔ تمہاری دکان میں نے دیکھی ہوئی ہے۔ میرا خیال ہے کہ
 میں نے تمہیں بھی وہاں دیکھا ہے۔“

پھر اس نے مجھ سے دو ایک باتیں کیں اور مارسیا کی تعظیم میں ذرا سا
 سر جھکا کر چلا گیا۔ مارسیا کہنے لگی۔

”ہماری قوم کے بارے میں یورپ میں مشہور ہے کہ اطالیہ کی
 عورتیں باتیں بہت کرتی ہیں۔ یقین کرو یہاں کے مرد بھی بڑی باتیں

کرتے ہیں۔ باتیں کرنے والی قومیں دس کی بڑی صاف ہوتی ہیں۔ کشادہ ہوتی ہیں۔ انگریز خاموش رہتا ہے اور وہ کتنا خطرناک ہے اس کا تجربہ تو ہم لوگوں کو بہت ہو چکا ہے۔“

مارسیا ہاتس کرتی مجھے بڑی اچھی لگ رہی تھی۔ اس وقت میں نے محسوس کیا کہ اس کی آواز میں ایک خاص کشش ہے۔ آواز بڑی اہم چیز ہے اسے حمید — تم بھی ریڈیو کے آری ہو۔ میں بھی ریڈیو کا آری ہوں۔ ہم دونوں آواز کی اہمیت کو بڑی اچھی طرح سے سمجھتے ہیں۔ خاص طور پر عورت کی آواز کا ایک بالکل الگ اثر ایک بالکل الگ سائیکالوجی ہوتی ہے۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ مارسیا کی مسکراہٹ میں ایک خاص بات تھی۔ وہ خاص بات یہ تھی کہ مسکراتے وقت وہ اپنے خوبصورت ناک کو تھوڑا نیچا لیتی تھی۔ ہو سکتا ہے وہ ایسا جان بوجھ کر کرتی ہو۔ ہو سکتا ہے یہ خود بخود ہوتا ہو۔ بہر حال یہ بات مجھے اچھی لگی اور اس کا بھی مجھ پر اثر ہوا۔

میں نے اشفاق سے کہا۔

”اس کا مطلب ہے کہ تمہیں اس سے محبت ہو گئی تھی۔“

نہیں نہیں ایسی بات نہیں تھی۔ کہ از کم اس وقت تک نہیں تھی۔ بعد میں ایسا ضرور ہو گیا تھا۔ اسی لئے میں تمہیں یہ داستان منزل بہ منزل سنا رہا ہوں۔ بس تم سنے جاؤ۔ سچ میں بولومٹ۔ نہیں تو میں بھول جاؤں گا اور میں تمہیں پوری تفصیل کے ساتھ یہ داستان سنائی چاہتا ہوں۔ یہ دیو داس کی طرح کوئی اتنی بڑی سرچیدہ نہیں ہے۔ ماریا ابھی اٹالیہ میں زندہ ہے۔ اگرچہ ہسپتال میں ہے اور اس کی یہ حالت میرے غم میں نہیں ہوئی۔ پھر بھی اس داستان میں ایک جیسی پہلکی اواسی ہی ہے جو مجھے پسند ہے اور مجھے یقین ہے کہ تمہیں بھی پسند آئے گی۔ تو میں تمہیں روما یونیورسٹی میں ماریا سے اپنی پہلی تفصیلی ملاقات کا حال سنا رہا تھا جب میں نے وہاں یوم آزادی پاکستان کی تقریب پر اسے پایا ہوا تھا۔ یہ تو مجھے اس کی گفتگو سے پتہ چل ہی گیا تھا کہ

اس کا تعلق روم کے ایک قدیم خاندان سے تھا جو صدیوں سے وہاں آباد تھا مگر جس کا جاہ و چشم وقت کی دست برو سے ختم ہو چکا تھا۔ میں نے یہ بھی اندازہ لگا لیا تھا کہ ماریا کا رجحان شنشائیت پرستی کی طرف ہے اگرچہ شنشائیت کو روم میں ختم ہوئے ایک مدت گزر چکی تھی۔ اس اعتبار سے وہ مسولینی کو پسند کرتی تھی۔ اگرچہ اس کا اظہار اس نے دہلی زبان میں ہی کیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جنگ ختم ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا اور اعلیٰ میں مسولینی کی فاشٹ پارٹی کا ذکر نفرت سے کیا جاتا تھا۔ لوگ کہتے تھے کہ مسولینی نے ملک کو جاہ کر دیا اور اس کو جرمنوں کے ہاتھوں بیچ دیا تھا۔

ماریا سے میری یہ ملاقات یادگار ملاقاتوں میں سے ہے۔ اس ملاقات میں ہمیں ایک دوسرے کو سمجھنے کا موقع ملا تھا۔ جب میں ماریا کو رخصت کرنے کیفے ٹیرا کی لابی تک آیا تو میں نے اس سے اس کی رہائش کے بارے میں پوچھا۔ ماریا مسکرا دی۔ کہنے لگی۔

”میں اپنے آپا اجداد کے محل میں رہتی ہوں۔ تم آؤ گے تو تمہیں اپنے محل کی شہ نشیں اور تاج و تخت دکھاؤں گی۔“

میں نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

”مگر مجھے تو پتہ ہی نہیں کہ یہ محل کہاں ہے؟“

مارسیا نے مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

”میرا شاہی رتھ تمہیں لینے آئے گا۔“

اور وہ مسکراتی ہوئی ہاتھ ہلاتی ہوئی رخصت ہو گئی۔ ماریا کو رخصت کرنے کے بعد میں دوسرے صباؤں سے باتیں کرنے اور ان کی خاطر مدارت میں لگ گیا۔

ابھی تک ایسی کوئی بات نہیں تھی کہ مجھے ماریسا کا جبروم خیال رہنے لگا۔

ہو یا اس کے ساتھ عاشقانہ ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا ہو۔ ہفتے میں ایک آٹھ بار اس کا فون آجائے۔ رسی سی بات چیت ہوتی۔ ہاں یہ بات ضرور تھی کہ

دو مجھے ایک پندیدہ دوست کی طرح اچھی لگنے لگی تھی اور جب اس کا فون آتا یا کسی روز اس سے مختصر سی ملاقات ہو جاتی تو مجھے بڑی خوشی ہوتی۔

ایک روز اس کا فون آیا۔ کہنے لگی۔

”آج تم میرے محل میں میرے ساتھ چائے پیو گے۔“

میں نے ہنس کر کہا۔

”تمہارا رتھ کس وقت مجھے لینے آئے گا۔“

دوسری طرف سے مجھے ماریا کے ہنسنے کی آواز سنائی دی۔ کہنے لگی۔

”میں خود رتھ لے کر آؤں گی۔ تمہیں شام پانچ بجے کہیں جانا تو

نہیں؟“

میری وہ شام خالی تھی۔ خالی نہ بھی ہوتی تو ماریا ایسی خاتون کے لئے میں اپنی دیگر مصروفیات منسوخ یا ملتوی کر دیتا۔ میں نے کہا۔

”نہیں! آج اتفاق سے میری شام بالکل خالی ہے۔“

دوسری طرف سے ماریا نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا۔

”میں ٹھیک پانچ بجے تمہاری یونیورسٹی میں آ جاؤں گی۔“

اس وقت دوپہر کے شاید دو اڑھائی بجے تھے۔ اب خدا جانے کیوں مجھے اس کا انتظار لگ گیا۔ بار بار ماریا کا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے آ جاتا۔ تم

اسے جاسیہ دوستی کہہ لو چاہے محبت کہہ لو۔ بہر حال میں بڑی بے چینی کے ساتھ شام کے پانچ بجنے کا انتظار کرنے لگا۔ ٹھیک پانچ بجے میں یونیورسٹی کے

پورچ کی عراب کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ یہاں وقت کی بڑی پابندی کی جاتی ہے۔ چنانچہ ایک منٹ بھی نہیں گزرا ہو گا کہ ایک عیسائی

گیٹ میں داخل ہوئی اور ایک طرف جا کر رک گئی۔ ماریا عیسائی سے نکل کر میری طرف آئی۔ میں بھی مسکراتا ہوا اس کی طرف بڑھا۔ ہم نے ایک

دوسرے سے ہاتھ ملایا۔ اس وقت بھی میرا ہاتھ ماریا کے ہاتھ کے مقابلے میں تھوڑا تھوڑا ٹھنڈا تھا۔ یہ بات مجھے اچھی نہ لگی۔ کیا میں زروس تھا؟ ماریا کے

ساتھ میں عیسائی میں بیٹھ گیا۔ عیسائی شہر کی کشادہ سڑکوں والے علاقے سے نکل کر دیرپائے ٹاؤن کے ساتھ ساتھ چلتی پرانے زمانے کی دیوہیکل عمارتوں والی بستی میں داخل ہو گئی۔ یہ نیم پہاڑی علاقہ تھا۔ گلیاں چھوٹی چھوٹی تھیں۔ چنانچہ ہم نے عیسائی چھوڑ دی تھی اور پتھریلی گلیوں میں پیدل چل رہے تھے۔ میں نے ماریا سے مذاقاً ”پوچھا۔“

”تمہارا محل ابھی تک نہیں آیا۔“

وہ ہنس دی۔ بائیں جانب اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

”وہ مانتے میرا محل ہے۔“

یہ ایک دو منزلہ قدیم رومن حویلی تھی جس کی دیوڑھی کے آگے دونوں جانب منگ مرمر کے چبوترے بنے ہوئے تھے۔ گلی میں بچے کھیل رہے تھے۔

مکانوں کے اندر سے عورتوں کے بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ حویلی کی دیوڑھی میں دو اونچے ستون تھے۔ جن پر ایک تیل چڑھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

یہاں مطلوب ٹھنڈک تھی۔ دیوڑھی میں سے ایک نیم تاریک زینہ دو سری منزل کو جاتا تھا۔ ماریا دو سری منزل کے ایک کمرے میں رہتی تھی۔ یہ

کمرہ کافی بڑا تھا۔ چھت اونچی تھی۔ دو لمبی کھڑکیاں تھیں جو گلی میں کھلتی تھیں۔ ان پر پردے لگے ہوئے تھے۔ ماریا نے ایک کھڑکی کا پردہ ہٹا دیا۔ پھر بھی

کمرے میں روشنی نہ ہوئی تو اس نے جی جلا دی۔ پردہ ڈال کر کمرے کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہوا تھا۔ ایک حصے میں ڈائیننگ ٹیبل لگی تھی۔ ساتھ

ہی ایک پرائیوٹ سیٹ پڑا تھا جس کا رنگ اڑچکا تھا۔ دوسری طرف پردے کے پیچھے ماریا نے اپنا بیڈ لگایا ہوا تھا۔ کچن زینے کے پاس ہی تھا۔

جس چیز نے مجھے اپنی طرف متوجہ کیا وہ اس کمرے میں لگی ہوئی دو چار پرانی روغنی تصویریں اور نوادرات تھے۔ دیوار پر ایک جگہ ڈھال اور تلواریں

لگی تھیں۔ کونے میں ایک پرانے زمانے کے نیزے کے اوپر سرخ ریشمی رین بندھا ہوا تھا۔ میزوں اور کرائس پر تانبے کے پرانے نقش پرانے تھالیاں اور

ایک گھدان پڑا تھا۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ ماریا نے جو ایک معمولی سی جاب کرتی ہے۔ اتنے قیمتی نوادرات کہاں سے اکٹھے کر لیتے ہیں۔ جب میں نے اس بارے میں سوال کیا تو وہ میز پر چائے کا سامان لگاتے ہوئے ہنسی اور کہا۔

”یہ سب اصل کی نقل ہے۔ صرف وہ جو کارنس کے درمیان میں تاجے کا گھدان ہے وہ اصلی ہے اور ہمارے خاندان میں اب تک چلا آ رہا تھا۔ میرے والد اسے بھی بیچنے لگے تھے کہ میں اسے لے کر دوسرے شہر اپنی ایک سیٹل کے پاس چلی گئی۔ اس طرح میں نے اپنے پوڈشا خاندان کی اس آخری نشانی کو بچالیا۔ اس کے عوض مجھے بھاری رقم کی پیشکش بھی ہوئی ہے مگر میں نے اسے فروخت نہیں کیا۔“

میں دیوار پر لگی آئینل ویسنگٹن کو دیکھنے لگا۔ ان میں ایک تصویر اٹلی کے ایک ماسٹر پینٹر کی بنائی ہوئی تھی۔ میں اسے غور سے دیکھ رہا تھا کہ ماریا کی بیچھے سے آواز آئی۔

”یہ میٹنگ بھی اصل کی نقل ہے۔ اس قسم کی تصویریں یہاں عام مل جاتی ہیں۔“

کارنس کے کونے میں چھوٹے سائز کی ایک رنگین تصویر بھی ہوئی تھی۔ یہ بڑی بڑی مونچھوں اور بھری ہوئی داڑھی والے ایک بوڑھے شخص کا پورٹریٹ تھا۔ جس نے سر پر خود پہن رکھا تھا۔ اس تصویر کے رنگ پھیکے پڑ چکے تھے اور جگہ جگہ خراشیں اور لکیریں پڑی ہوئی تھیں۔ میں نے ماریا سے اس تصویر کے بارے میں پوچھا تو وہ میرے قریب آگئی۔ کہنے لگی۔

”یہ شارل آئرش پوڈشا میرے دادا کے والد کا پورٹریٹ ہے۔ یہ حویلی ان کے دادا نے بنوائی تھی۔ بارویں صدی عیسوی میں جب فریڈرک بار ہاروسا شہنشاہ بنا تو وہ امراء اور روساء جو بیڑوں کے زمانے میں شہر سے باہر اپنے اپنے قلعوں میں چلے گئے تھے۔ واپس

شہروں میں آگئے۔ یہاں انہوں نے اپنے لئے مکانات اور حویلیاں بنوائیں اور یہیں رہنے لگے۔ ان میں زیادہ تعداد کی بے لین امراء اور جنگ جو شاہ سواروں کی تھی۔ میرے جد امجد کا تعلق بھی شہنشاہیت پسند کی بے لین امراء کے طبقے سے تھا۔ گی بے لین جماعت کو بادشاہ کی حمایت حاصل تھی۔ میرے دادا کے دادا اسی شہر کے ناظم مقرر ہوئے۔ شہر کے ناظم کو پوڈشا کہا جاتا تھا۔ چنانچہ ہمارا خاندان پوڈشا خان کے نام سے مشہور ہو گیا۔ مگر میں اپنے نام کے ساتھ پوڈشا نہیں لکھتی۔“

”کیوں؟“ میں نے پوچھا۔ ”اگر تم شہنشاہیت پرست ہو تو پھر اس کا اعلان کرنے میں کیا حرج ہے؟“

ماریا نے براؤن کمر کا ایک چھوٹا سا ایک خود بنایا ہوا تھا۔ اس کے اوپر کریم سے سفید پھول بنا ہوا تھا۔ وہ کیک کا ٹرنے میز پر رکھ رہی تھی۔ کہنے لگی۔

”میں اس نام کی بے حرمتی نہیں کرنا چاہتی۔ میں اطالیہ کے ایسے کئی خاندانوں کو جانتی ہوں جو حقیقت میں پوڈشا نہیں ہیں مگر اپنے ساتھ پوڈشا ضرور لکھتے ہیں۔“

وہ میز کے قریب کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی اور کیک کے اوپر جو کریم کا سفید پھول بنا تھا اس کی طرف چھری سے اشارہ کر کے بولی۔

”جانتے ہو میں نے یہ سفید پھول کیوں بنایا ہے؟ میں تمہیں بتاتی ہوں۔ تیرہویں صدی عیسوی کے شروع میں ہمارا ملک خوفناک خانہ جنگی کی لپیٹ میں آیا ہوا تھا۔ دو سیاسی جماعتیں بن گئی تھیں۔ ایک جماعت گولڈن کمانٹی تھی اور دوسری جماعت گی بے لین۔ پہلی جماعت عام شہریوں اور مزدوروں، محنت کشوں کی جماعت تھی۔ جبکہ دوسری جماعت کا تعلق امیر طبقہ کے لوگوں، جنگ جو روساء

اور شاہ سواروں سے تھا۔ میرے جد امجد بھی گی بنے لیکن تھے۔ ان دونوں جماعتوں کی آپس میں اس قدر دشمنی تھی کہ انہوں نے اپنی ہر شے دوسری جماعت سے الگ کر رکھی تھی۔ مثلاً اگر کوئی نعت جماعت کے لوگ سڑک پر بائیں ہاتھ کو چلتے تھے تو گی بنے لیکن جماعت والے دائیں ہاتھ چلتے تھے۔ گوہلن جماعت والوں نے اپنا نشان سرخ گلاب بنالیا تھا۔ جبکہ گی بنے لیکن جماعت والوں نے سفید گلاب اپنا نشان منتخب کیا تھا۔ اب وہ لوگ نہیں رہے۔ تاریخ نے ان دونوں جماعتوں کو ختم کر دیا ہے۔ مگر میں اپنے اجداد کی خانہ دانی روایت کو نبھا رہی ہوں۔

مارسیا چائے بنا رہی تھی۔ ساتھ ساتھ باتیں بھی کرتی جا رہی تھی اور اپنے خاندان کا تاریخی پس منظر بیان کر رہی تھی۔ تب مجھے معلوم ہوا کہ اس عورت کو جس کی عمر پچیس تھیں سال سے زیادہ نہیں تھی اپنے خاندان کے نام و نسب سے کس قدر محبت تھی۔ اسے اپنے خاندان کے ریفرنس سے اطالیہ کی سات آٹھ سو سالہ خاندان بنکیوں اور سیاسی منافرت کی پوری تاریخ یاد تھی۔

اس نے چائے کی پیالی میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”یہ اصل میں شہنشاہیت اور پاپائے روم کی جنگ تھی۔ یہ منافرت کا زہر تھا جو صدیوں تک اطالیہ کے خون میں گردش کرتا چلا گیا۔ ہمارے سب سے بڑے شاعر دانٹے کے خاندان کا تعلق دوسری جماعت سے تھا مگر اس کا دل ہمارے جد امجد کی جماعت کی بنے لیکن کے ساتھ دھڑکتا تھا۔ کیونکہ دانٹے خود شہنشاہیت کا حامی تھا۔ وہ بھی یہی سمجھتا تھا کہ ایک عالم اعلیٰ ہی ملک میں امن قائم رکھ سکتا ہے۔“

میں نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے مارسیا سے پوچھا۔

”کیا تم بھی یہی سمجھتی ہو؟“

وہ خاموش نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگی۔ پھر بولی۔

”ہاں! میں بھی ایک حاکم اعلیٰ کی قائل ہوں۔ جمہوریت نے ہمیں بڑا نقصان پہنچایا ہے۔ جمہوریت کے ہاتھوں اطالیہ کی شہری ریاستوں کی تاریخ ہر دور میں ہمیں خون آلود نظر آتی ہے۔“

”پھر تو مسولینی ضرور تمہارا ہیرو ہو گا۔“

”تم نے ٹھیک کہا پرو فیسور!“ مارسیا مسکراتے ہوئے بولی۔ ”اطالیہ کو صدیوں بعد ایک ہیرو ملا تھا جس نے فریڈرک دوم کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اطالیہ کو ایک متحد قومیت دینے کی کوشش کی تھی۔ وہ سلطنت روم کی قدیم شان و شوکت کو پھر سے زندہ کرنا چاہتا تھا۔ مگر افسوس کہ مسولینی میں فریڈرک ثانی کا جذبہ تو ضرور تھا مگر اس جیسی سیاسی بصیرت اور کشادہ دلی نہیں تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جس قوم کی سرہلندی کے لئے وہ اٹھا تھا اسی قوم نے اسے گولیاں مار کر اس کی لاش بجلی کے کھمبے کے ساتھ لٹکا دی۔“

چائے ویسی ہی تھی جیسی یورپ میں ہوا کرتی تھی۔ یعنی ہلکی اور لطیف ہے حد لطیف۔ ہاں مارسیا نے جو کیک بنایا تھا وہ بڑا مزیدار تھا۔ اطالیہ والوں پر عربوں خاص طور پر شمالی افریقہ کے مسلمانوں کے کلچر کا بہت اثر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کھانوں میں گرم مصالحوں کا احتراز یورپ کے دوسرے ملکوں کے مقابلے میں نمایاں نظر آتا ہے۔ میں نے مارسیا سے کہا۔

”اس کا مطلب ہوا کہ تم تو بڑی امیر عورت ہو۔ یہ ساری حویلی تمہاری ملکیت میں ہوگی۔“

مارسیا نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور کہنے لگی۔

”سچی اس محلے کی آدھی حویلیاں ہماری تھیں۔ میرے دادا نے بڑی جائیداد چھوڑی تھی۔ مگر میرے باپ نے اسے عیاشیوں میں اڑا دیا۔ ایک ایک کر کے ساری حویلیاں بیچ ڈالیں۔ آخر یہ ایک حویلی

رہ گئی۔ اس کے چار حصے تھے۔ تین حصے یک گئے۔ بس یہ ایک چھوٹا سا کمرہ میرے پاس رہ گیا ہے۔ اس پر بھی میرا بھائی جو فرانس میں ہے اپنا حق جتنا دیتا ہے۔ کبھی کبھی کمرے میں اس کا کارڈ آتا ہے تو اس میں لکھا ہوتا ہے کہ میں اس بار آکر حویلی کے باقی ماندہ حصے کو بھی فروخت کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ تم فکر نہ کرو، تمہیں میں ایک نیا فلیٹ خرید دوں گا۔“

مارسیا خاموش ہو گئی۔ چائے بناتے ہوئے میری طرف دیکھ کر پوچھنے لگی۔

”سینور! کیا تمہارے ملک میں بھی بھائی اپنی بہنوں سے ایسا ہی سلوک کرتے ہیں؟ میں نے تو سنا ہے کہ اورینٹ میں خاندان کے افراد ایک جان ہو کر رہتے ہیں۔“

میں نے اسے پوری تفصیل سے پاکستانی خاندانوں کے آپس میں روابط اور بہن بھائیوں کے پیار، ماں باپ کے ادب، آداب اور بزرگوں کے احترام کے بارے میں بتایا۔ وہ بڑے رشک سے مجھے سمجھنے لگی۔

”پرو فیور! مجھے تو تمہارے ملک میں پیدا ہونا چاہیے تھا۔“

میں نے اسے کوئی جواب نہ دیا۔ خاموشی سے چائے پیتا رہا۔ میں اسے جواب دینا نہیں چاہتا تھا۔ میں اسے مایوس ہوتا نہیں دیکھ سکتا تھا۔“

○

ایک روز مارسیا مجھے اپنے آباؤ اجداد کی قبریں دکھانے قبرستان لے گئی۔ یہ قبرستان اپنی پرانی قبروں کے لئے مشہور تھا اور شہر سے دور ایک سکون جگہ پر واقع تھا۔ یہاں بڑی پرانی قبریں تھیں۔ ایک قبر پر 1301ء اسن لکھا تھا۔ ساری قبریں شکستہ تھیں۔ ان کی میلیں اور مجھے ٹیڑھے دھکے ہوئے تھے۔ مارسیا پر قبرستان میں داخل ہوتے ہی گہری خاموشی اور الجھدی طاری ہو گئی تھی۔ قبروں کا ماحول ہی ایسا تھا کہ میں بھی خاموش ہو گیا۔ وہ مجھے اونچے اونچے درختوں کے درمیان بنی ہوئی ایک قبر پر لے گئی۔ قبر کتبہ ایک طرف کو نیچے جھکا ہوا تھا۔ اس پر لکھے ہوئے لاطینی الفاظ بالکل سمجھ میں نہ جا رہے تھے۔ جو الفاظ پتھر میں کھودے گئے تھے۔ ان کی سیاہی بھی زچکی تھی اور پتھر کے ساتھ پتھر ہو گئے تھے۔ مارسیا نے بتایا کہ یہ اس کے دادا کی قبر ہے۔ اس نے مجھے اپنے دوسرے بزرگوں کی قبریں اور ماں باپ کی ریں بھی دکھائیں۔ ماں باپ کی قبریں شکستہ حالت میں نہیں تھیں۔ وہ ایک رکے چوڑے کے پاس بیٹھ گئی۔ میں بھی اس کے قریب بیٹھ گیا۔ وہ سامنے کی جانب ساپرس کے درختوں میں مسلسل تک رہی تھی۔ میں نے یہی سمجھا کہ وہ اپنے ماں باپ اور خاندان والوں کی یاد میں گم ہے۔ اچانک اس نے تھ سے ساپرس کے درختوں کی طرف اشارہ کیا جیسے کسی کو رکھنے کے لئے رہ رہی ہو۔ میں نے ساپرس کے درختوں کی طرف دیکھا۔ مگر مجھے وہاں کوئی منظر نہ آیا۔ میں نے یونہی پوچھ لیا۔

”کون تھا؟“

مارسیا کے چہرے پر اداس مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اس نے سر جھکا لیا۔
ایک لمبا سانس لیا اور میری طرف دیکھ کر بولی۔

”کیا تم اس بات پر یقین رکھتے ہو کہ مرنے کے بعد روہیں اپنی
قبروں پر آتی ہیں؟“

مجھ سے اتنا اہم سوال اچانک پوچھا گیا تھا۔ میں مارسیا کو نکتا رہ گیا۔
کوئی جواب نہ دے سکا۔ مارسیا نے میرے جواب کا انتظار کئے بغیر کہا۔

”میں نے روہوں کو اپنی قبروں پر اترتے دیکھا ہے۔ ابھی ابھی ایک
روح اپنی قبر دیکھنے آئی تھی۔“

”کہاں؟“ میں نے تعجب سے پوچھا۔
”ان درختوں کے پاس۔“

مارسیا نے ساہنس کے درختوں کی طرف اشارہ کیا۔ مجھے محسوس ہونے
لگا کہ مارسیا یا تو حد سے بڑھی ہوئی عقیدت رکھنے والی لڑکی ہے اور یا پھر وہ
بکی بکی باتیں کر رہی ہے۔ ساہنس کے درختوں سے نظریں ہٹا کر اس نے
میری طرف دیکھا۔

”تم ضرور سوچ رہے ہو گے کہ میں بالکل بے کی باتیں کر رہی
ہوں۔ لیکن ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں ساہنس کے درختوں
والی روح کو بالکل اس طرح دیکھ رہی تھی جس طرح میں تمہیں
دیکھ رہی ہوں۔“

”وہ کس کی روح ہے؟“ میں نے پوچھا۔

مارسیا ایک دو سینڈ خاموش رہی۔ پھر کہنے لگی۔

”ابھی تک مجھے صرف اتنا معلوم ہے کہ وہ گی بے لین خاندان کے
ایک اعلیٰ نسب نبوتوان کی روح ہے جو شہسوار بھی تھا اور مطلب
بھی تھا۔ اسے مرنے ساڑھے چھ سو برس ہو چکے ہیں۔ مگر اس کی
روح مجھ سے ملنے آتی ہے۔ کبھی چاندنی رات میں میرے کمرے

میں اور کبھی اس قبرستان میں۔ میں جب کبھی اس قبرستان
میں آتی ہوں تو اسے معلوم ہو جاتا ہے اور وہ اپنی روح کی شکل میں
مجھ سے ملنے اپنی قبر پر آ جاتا ہے۔ اس کا نام یوزوٹو ہے۔“

مارسیا نے ایک سرد آہ بھری اور بولی۔
”پرو نیسور! میں نہیں جانتی کہ تمہاری شخصیت میں ایسی کوئی بات
ہے کہ میں نے یہ راز تمہیں بیان کر دیا ہے۔ یوزوٹو کی روح نے
مجھ سے وعدہ لے رکھا ہے کہ میں یہ بات کسی کو نہیں بتاؤں گی۔ مگر
میں نے اس سے بھی وعدہ لے لیا تھا کہ زندگی میں یہ راز تم از کم
ایک آدمی کو ضرور بتاؤں گی۔ جانتے ہو اس کی وجہ کیا تھی؟ وجہ یہ
تھی کہ میں جانتی تھی کہ میری زندگی میں کبھی نہ کبھی ایک مرد ایسا
ضرور آئے گا جس کو میں اپنا ہم راز بتاؤں گی اور پرو نیسور وہ مرد تم
ہو۔“

میں شرمسار سا ہو گیا۔ میں نے کہا۔

”مارسیا! یہ تمہاری مریانی ہے۔ کہ تم نے مجھے اس لائق سمجھا۔“

مارسیا نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ اس کا ہاتھ گرم تھا اور ذرا سا
کیکلیا کھینچنے لگی۔

”نہیں نیسور! میں نے اپنے دل کا حال تمہیں بیان کیا ہے۔ میں
نہیں کہہ سکتی کہ مجھے تم سے محبت ہے یا نہیں لیکن اتنا مجھے یقین
ہے کہ وہ تم ہی آدمی ہو جس پر میں نے اپنی زندگی کے سب سے
پر اسرار راز کو ظاہر کرنا تھا اور جس کے لئے میں نے شہسوار یوزوٹو
کی روح سے وعدہ لے رکھا تھا۔“

جب ہم قبرستان سے نکلنے لگے تو میں نے شہسوار یوزوٹو کی قبر دیکھنے کی
خواہش کی جس کی روح بتول مارسیا اسے ملنے آتی تھی۔ مگر مارسیا نے مجھے
ساہنس کے درختوں والی قبر کی طرف جانے سے روک دیا۔ میرے لئے مارسیا

ایک پر اسرار لڑکی بنتی جا رہی تھی۔ کبھی خیال تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہی ہے سچ ہے اور بروہو کی روح اسے ضرور نظر آتی ہوگی۔ کبھی سوچتا کہ ماریا ایک نفسیاتی کیس ہے۔ وہ ماضی پرست اور خیالوں میں رہنے والی لڑکی ہے۔ روح کے بارے میں وہ جو کچھ بتاتی ہے اس میں کوئی حقیقت نہیں ہے۔ جب میں نے اپنے اس شے کو دور کرنے کے لئے اس سے کہا کہ وہ مجھے بھی بروہو کی روح دکھائے تو وہ کہنے لگی۔

”وہ تمہیں نظر نہیں آئے گی۔ روح کو دیکھنے کے لئے اپنے مادی جسم سے باہر نکلتا پڑتا ہے اور تم ایسا نہیں کر سکتے۔“

میں نے کہا۔

”لیکن تم اپنے جسم میں رہ کر روح کو دیکھتی ہو۔“

ماریا مسکرائی۔ اس کی مسکراہٹ بڑی پر اسرار تھی اور ہم قبرستان کے گیت کی طرف جا رہے تھے۔ کہنے لگی۔

”یہی تم میں اور مجھ میں فرق ہے۔ میں جب بروہو کی روح کو دیکھتی ہوں اور وہ مابہر سے کے درختوں میں دور سے مجھے اشارہ کرتی ہے تو اس وقت میں اپنے جسم کے اندر نہیں ہوتی۔ میں — یعنی میری جو روح ہے وہ اپنے جسم سے باہر ہوتی ہے۔“

پھر ایک سرو آہ بھر کر بولی۔

”سینورا تم ان باتوں کو نہیں سمجھ سکو گے۔“

اس روز میں رات دیر تک ماریا کے بارے میں سوچتا رہا۔ پھر کافی بنا کر پی اور ٹیلی ویژن پر میوزیکل پروگرام دیکھنے لگا۔ میں نے ماریا کا خیال دل سے نکال دیا تھا۔ دراصل میں اس قسم کی نفسیاتی الجھنوں کا شکار لڑکی سے اپنے آپ کو دور ہی رکھنا چاہتا تھا۔

لیکن ماریا نے مجھے اپنی زندگی کا ہم راہ بنالیا تھا۔ اپنی طرف سے وہ مجھے بہت بڑا اعزاز دے چکی تھی۔ جہاں تک میں سوچتا ہوں وہ مجھ سے محبت

کرتے لگی تھی لیکن وہ اپنی محبت کو کسی دوسری روح کے ساتھ منسلک کر رہی تھی۔ اس کی وجہ وہی بہتر جانتی تھی۔ اس دوران مجھے جو اس کے ساتھ تھوڑی تھوڑی محبت ہونے لگی تھی اسے میں نے وہیں روک لیا اور اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔ ایک تو ویسے ہی میں محبت وغیرہ کے جھنجھٹ میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ یہ میری لائن ہی نہیں تھی۔ دوسرے ماریا روحوں کی دنیا میں رہنے والی لڑکی تھی جو میری نفسیات کو بھی کسی ابھرنے میں مبتلا کر سکتی تھی۔ پہلے میں اسے دو ایک فون کر لیا لیتا تھا۔ اب میں نے خاموشی اختیار کر لی۔ ماریا برابر مجھے فون کرتی۔ میرا حال پوچھتی اور گھر آکر کافی پینے کی دعوت بھی دیتی۔ میں کوئی بمانہ بنا کر ٹال دیتا۔ اس دوران یونیورسٹی میں تعطیلات آگئیں۔

میں ماریا کو بتائے بغیر سیر دیاحت کرنے وینس کی طرف نکل گیا۔ وینس اطالیہ کا وہی شہر ہے جس کی گلیوں میں شہر میں بہتی ہیں۔ اس شہر کی تاریخ بھی بڑی دلچسپ ہے مگر اس وقت میں تاریخ کے اوراق نہیں کھولنا چاہتا۔ وینس میں مجھے والی ایم سی اے کے ہوٹل میں ایک کمرہ مل گیا۔ میں ناشتہ کر کے ہوٹل سے نکل جاتا اور چھوٹے چھوٹے جزیروں بلکہ ٹاپوؤں پر بیٹھ ہوتی سنگ مرمر کی حویلیوں اور قدیم مکانوں کی سیر کرتا۔ گندولا یعنی کشتی پر بیٹھ کر وینس کی شہری گلیوں کی سیریں کرتا۔ دوپہر کو ہوٹل واپس آکر کھانا کھاتا اور تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد پھر نکل جاتا۔

ایک روز دوپہر کا وقت تھا۔ وینس شہر میں بڑی خوشگوار چمکیلی دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ میں ایک سنور میں اپنے لئے ایک جیکٹ دیکھ رہا تھا۔ جیکٹ پر پھول کچھ زیادہ ہی بنے ہوئے تھے۔ میں سادہ جیکٹ چاہتا تھا۔ میں جیکٹ کو دیکھ کر میں انکانے کے بعد سنور کے دروازے کی طرف بڑھا ہی تھا کہ سامنے ماریا کھڑی نظر آئی۔ میں اسے دیکھ کر واقعی بھونچکا سا ہو کر رہ گیا۔ وینس روم سے کافی دور تھا۔ میں حیران ہوا کہ یہ لڑکی یہاں کیسے آئی۔ پھر سوچا کہ ہو سکتا ہے اپنے کسی کام سے آئی ہو۔ میں نے مسکراتے ہوئے اس سے ہاتھ ملایا۔ وہ

کہنے لگی۔

”تم نے مجھے بتایا ہی نہیں کہ وینس جا رہے ہو مگر مجھے پتہ چل گیا تھا۔“

میں نے کچھ شرمندہ سا ہو کر کہا۔

”میں جلدی میں پروگرام بن گیا۔ تمہیں اطلاع نہ کر سکا۔ تمہیں یونیورسٹی سے پتہ چلا ہو گا۔“

وہ رازداری کے ساتھ میرے قریب ہو کر بولی۔

”مجھے بدستور کی روح نے بتا دیا تھا۔ بس اسی وقت میں بھی تمہارے پیچھے پیچھے یہاں آ گئی۔“

میں کچھ گھبرا سا گیا۔ جتنا میں اس لڑکی سے دور رہتا چاہتا تھا اتنا ہی وہ میرے قریب آتی جا رہی تھی۔ میں نے سکا سا قہقہہ لگایا اور کہا۔

”چلو اچھا ہوا۔ اب اکٹھے شہر کی سیر کریں گے۔“

شہر کے پہلو میں ایک پرانا سارے ستوران تھا۔ ہم وہاں آکر بیٹھ گئے اور کافی پیتے ہوئے باتیں کرنے لگے۔ میں نے محسوس کیا کہ ماریسا پہلے سے عجیبی اختیار کر رہی ہے۔ اب اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی شدید ضرورت کے وقت نمودار ہوتی تھی۔ کافی کا ایک دو ٹول باتھوں میں پکڑے وہ رے ستوران کے شیشے والے دروازے کے باہر سڑک پر دیکھ رہی تھی۔ میں اس کی موجودگی میں عجیب سی الجھن محسوس کر رہا تھا۔ دل یہی چاہتا تھا کہ کوئی بیلانہ بنا کر ماریسا سے الگ ہو جاؤں۔ مگر ایسا ممکن نہیں تھا۔ اچانک ماریسا میری طرف متوجہ ہوئی۔ کہنے لگی۔

”سینور! میں تمہیں اس شہر کی ایک تاریخی یادگار دکھانا چاہتی ہوں۔ کیا میرے ساتھ چلو گے؟“

میں نے سوچا کہ تاریخی یادگاریں تو مجھے ویسے ہی ہیں۔ پھر ماریسا کے ساتھ چلنے میں کیا حرج ہے۔ میں نے خوش ہو کر کہا۔

”ضرور چلوں گا۔ یہ کس قسم کی تاریخی عمارت ہے۔ کیا کوئی پرانا محل یا قلعہ ہے؟“

ماریسا نے مک میز پر رکھا اور ہنستے ہوئے بولی۔

”یہ تمہیں وہاں چل کر بتاؤں گی۔ بلکہ تم خود دیکھ لو گے۔“

رے ستوران سے نکل کر ہم فٹ پاتھ پر چلے گئے۔ جہاں سڑک ختم ہوئی وہاں پینچ ایڈریاٹک کا سمندر شروع ہو گیا۔ ماریسا اور میں وہاں ایک گنڈولا میں سوار ہو گئے۔ گنڈولا یعنی کشتی شہر کی پانی سے بھری ہوئی گلیوں میں چل نکلی۔ ان گلیوں میں ایڈریاٹک سمندر کا پانی تھا۔ دونوں جانب پتھر کے قدیم مکانات تھے۔ ان کی سبک مرمر کی بارہ دریاں اور گیلیاں ہمارے اوپر جھکی ہوئی تھیں۔ سمندر کا پانی مکانات کی دیواروں اور میزحیوں سے ٹکرا کر پتکولے کھا رہا تھا۔ ہماری کشتی ایک تنگ گلی میں سے گزر کر دوسری طرف مڑی تو ماریسا نے اطلالی زبان میں ملاح سے کہا۔

”یہاں بائیں طرف کشتی روک دو۔“

وہاں بائیں طرف پانی میں ایک چھوٹا سا پرانا مکان تھا۔ جس کے برآمدے کی آدھی سیڑھیاں پانی میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ ملاح نے کشتی کو میزحیوں کے بالکل ساتھ لگا دیا۔ میں نے سوچا کہ یہ ضرور ماریسا کے آبِ اجداد کی چھوٹی ہوئی یا فروخت کی ہوئی حویلی ہوگی۔ کیونکہ اس حویلی میں پرانے قلعے یا محل والی کوئی بات نہیں تھی۔ ہم برآمدے میں آگئے۔ سامنے حویلی کا ستونوں والا پرانا دروازہ تھا۔ دروازہ کھڑکی کا تھا جو تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ میں نے ماریسا سے پوچھا۔

”کیا یہ کسی بزرگ کی قدیم خانقاہ ہے ماریسا؟“

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ آگے بڑھ کر دروازے کے ایک پت کو اندر کودھکیلا۔ چرچاہٹ کی آواز کے ساتھ دروازہ کھل گیا۔ میں نے دیکھا کہ اندر ایک کشادہ ڈیوڑھی تھی۔ ڈیوڑھی کے آگے بھی ایک محرابی دروازہ

تھا۔ جو آدھا کھلا تھا۔ وہاں سے روشنی آرہی تھی۔ یہ دن کی روشنی تھی۔ دروازے کی دوسری طرف ایک چھوٹا سا صحن تھا جس کے وسط میں ایک فوارہ لگا تھا۔ فوارہ ایک دیوینکل انسان کے مجسمے کی شکل میں تھا جس کا رنگ سواری پر چکا تھا۔ حوض بھی خشک تھا اور کہیں کہیں گھاس اُگ رہی تھی۔ سائے پھر ایک ستونوں والا برآمدہ تھا۔ ماریا مجھے برآمدے میں لے آئی۔ پھر اس نے برآمدے کی ایک کونجری کا دروازہ کھول دیا۔ کونجری میں اندھیرا تھا۔ دروازہ پورا کھلا تو کونجری میں دن کی روشنی داخل ہو گئی۔ اس روشنی میں مجھے اس پھوٹی سی کونجری کے وسط میں ایک پتھر کا چوتراہ نظر آیا جس کے چاروں طرف لوہے کے کندے لگے ہوئے تھے۔ ماریا محبت کے عالم میں اس چوتراہ کو دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے ہاتھ سے چوتراہ کی طرف اشارہ کیا اور بولی۔

”مجھے اس چوتراہ پر لوہے کے کندوں سے باندھ کر تھد کا نشانہ بنایا جاتا تھا۔ وہ لوگ موسیقی کے حامیوں کو چن چن کر قتل کر رہے تھے۔“

ماریا نے بتایا کہ جب اتحادی فوجیں اٹلی میں داخل ہوئیں تو ہر طرف قتل و خون ریزی کا بازار گرم ہو گیا۔ موسیقی کو گولی مار کر پورا ہے میں سمجھے پر لٹکا دیا گیا۔ ماریا نے ایک عقلمندی کی تھی۔ حالات کا اندازہ لگاتے ہوئے اس نے کسی طریقے سے اپنے ماں باپ کو بھائی کے ساتھ یونان بھیج دیا تھا۔ مگر اسے مخالف پارٹی کے آدمیوں نے پکڑ لیا۔ انہوں نے ماریا کو قتل تو نہ کیا مگر اسے ہر قسم کے تھد کا نشانہ بنایا۔ وہیں میں وہ مجھے ساتھ لے کر خاص طور پر وہ نیم تاریک حویلی والا چوتراہ دیکھنے آئی تھی۔ کہنے لگی۔

”یہ بڑی دردناک کہانی ہے۔ بہر حال میری زندگی باقی تھی۔ میں بچ گئی۔ یہ چوتراہ مجھے ماضی کے عذاب یاد دلاتا ہے۔ میں جب بھی وہیں آتی ہوں تو اس چوتراہ کو دیکھنے ضرور آتی ہوں۔“

میں تین دن وہیں میں ٹھہرا۔ اس دوران ماریا دوسرے شہر جا چکی تھی۔ واپس روم آیا تو اسے فون کیا معلوم ہوا کہ وہ ابھی روم واپس نہیں آئی۔“

یہاں اشفاق احمد کا یا اٹالیہ کی ماریا کا رومان ختم ہو جاتا ہے۔ میں نے ساری داستان سن کر اشفاق سے کہا۔

”یہ بڑی دردناک کہانی ہے۔ اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو اس پر

ایک دل کو گداز کرنے والا ناول لکھتا۔“

اشفاق احمد نے بڑے افسردہ حیم کے ساتھ کہا۔

”تم تو ناول لکھ کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لیتے تھو کہ کیا کروں؟“

اس وقت مجھے شدت سے احساس ہوا کہ یہ شخص اندر سے کس قدر حساس اور گداز ہے۔ اسے اس لڑکی کا غم تھا مگر یہ غم اس نے مجھ پر بھی ظاہر نہیں کیا تھا اور اگر اس روز جب اسے ماریا کا خط ملا، میں اس کے پاس نہ بیٹھا ہوتا تو وہ یہ کہانی مجھے کبھی نہ سنا۔ میں اسے کردار کی ایک خوبی سمجھتا ہوں اور اشفاق احمد میں یہ خوبی موجود ہے۔

- زندگی کے ورثہ پر تصوف کا پھل عام طور پر عمر کے آخری حصے میں جا کر لگتا ہے۔ نوجوانی کے زمانے میں مجھے نہیں یاد کہ اشفاق احمد نے مجھ سے کبھی تصوف کے موضوع پر کوئی بات کی ہو۔ یہ زمانہ ہنسنے کھیلنے اور موج اڑانے کا ہوتا ہے۔ البتہ درمیانی عمر میں آکر اشفاق نے تصوف کی باتیں شروع کر دی تھیں۔ یہ باتیں کسی ایسے سالک کی نہیں تھیں جو حقیقت کی تلاش میں نکلا ہو۔ بلکہ ایسے پیر باغفا کی باتیں ہوتی تھیں جس نے حقائق و معارف کی منزل پائی ہو۔ نفعیاتی طور پر وہ کسی ایسے پیر کامل کی تلاش میں تھا جو اسے اپنا مرید بنانے کی بجائے پیر کامل بنادے۔ آسان لفظوں میں یوں سمجھ لیں کہ اشفاق احمد خود پیر بننا چاہتا تھا۔ میرے سامنے وہ تصوف کی باتیں بہت کم کرتا۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ مجھے اس کے تصوف سے کوئی دلچسپی نہیں ہے

مگر اپنے سے علی اعتبار سے کم تر اور اپنے ماتحت لوگوں میں بیٹھ کر وہ تصوف پر دقتی قسم کے پیکر دتا اور وہ لوگ کچھ نہ سمجھتے ہوئے سر ہلاتے رہتے جو سر مضبوط نہ ہو وہ بڑی جلدی مل جاتا ہے۔

مجھے خبر ملتی رہتی کہ آج اشفاق احمد فلاں پیر کے ڈیرے پر گیا ہے۔ آج فلاں پیر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا ہے۔ میں نے کبھی کوئی دلچسپی نہیں لی تھی۔ کبھی کبھی وہ خود مجھے بتاتا کہ آج میں فلاں بزرگ کے پاس گیا تھا۔ بڑے کمال کا آدمی ہے۔ اس کے ڈیرے پر ہر وقت لنگر کھلا رہتا ہے۔ جو کوئی آئے بزرگ بابائی سب سے پہلے اسے کھانا کھلاتے ہیں۔ میں کہتا۔

”ضرور وہ بڑے نیک دل بزرگ ہیں ان سے فیض حاصل کرو۔“

مجھے معلوم نہیں کہ اشفاق احمد نے کسی بزرگ سے فیض حاصل کیا یا نہیں لیکن وہ بڑے بڑے باعفا بزرگوں کے پاس دوڑ دوڑ کر جاتا رہا ہے۔ کچھ روز کسی بزرگ کی مجلس میں بیٹھا ہے۔ ہر محفل میں اس کا ذکر کرتا ہے اور پھر اس بزرگ کو چھوڑ کر کسی دوسرے بزرگ کی تلاش میں نکل پھڑا ہوتا ہے۔ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں اشفاق احمد کو خود پیر بننے کا شوق ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب اسے کسی پیر کی نہیں بلکہ اپنے مریدوں کی تلاش ہے۔ بہر حال یہ اس کا خالص ذاتی معاملہ ہے۔ ہو سکتا ہے اندر سے وہ پورا صوفی بن چکا ہو اور اس نے حقیقت کو پایا ہو۔ ہو سکتا ہے وہ ابھی جنہوں کی تلاش میں ہو۔ ہو سکتا ہے کہ نہ اسے حقیقت سے کوئی دلچسپی ہو اور نہ کسی پیر کمال کی تلاش ہو اور وہ محض تصوف پر باتیں ہی کرنی چاہتا ہو۔ اس کا تصوف محض بحث مباحثے اور تصوف کی اصطلاحوں تک ہی محدود ہو۔

اشفاق کو تصوف کی اصطلاحیں بولنے کا بڑا شوق ہے۔ ایک زمانے میں اس کے منہ پر ”تجوید“ کا لفظ بڑا چڑھا ہوا تھا۔ وہ یہ لفظ تصوف کی گنگو کرتے ہوئے بار بار استعمال کرتا تھا۔ میں نے ایک دن پوچھا۔

”یہ تجوید کیا چیز ہے؟“

اس پر اشفاق نے مجھے ایک لیکچر دیا۔ میں پہلے ہی پریشان تھا۔ اس کا پھر سن کر اور پریشان ہو گیا۔ یہ لفظ ”تجوید“ بھی اس کا ساتھ چھوڑ گیا۔

لاہور شہر سے باہر ایک بزرگ راضی سائیں کا ڈیرا تھا۔ اشفاق احمد جس اویس کے ساتھ ان بزرگ کی خدمت میں اکثر حاضری دیتا تھا ان دنوں وہ ان بزرگ کا ہر مجلس میں ذکر کرتا۔ کہیں کوئی خطبہ صداقت پڑھتا تو اس میں بھی اسی بزرگ کا کسی نہ کسی طریقے سے ضرور ذکر کرتا۔ پھر ایک وقت آیا کہ اس بزرگ کے بارے میں خاموش ہو گیا۔ میں نے بھی اس سے اس بارے میں کچھ نہ پوچھا۔ کیونکہ مجھے اس کی زندگی کے اس پہلو سے کبھی بھی کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ مجھے اس کی دوستی عزیز تھی اور آج بھی ہے۔ وہ مجھے چھا لگتا تھا اور آج بھی اسی طرح اچھا لگتا ہے۔ تصوف سے ہٹ کر وہ جس موضوع پر بھی بات کرے میں اس میں بڑی دلچسپی لیتا ہوں۔ اسے شوق سے سنتا ہوں۔ ایک عجیب بات میں نے اشفاق احمد میں دیکھی ہے کہ وہ اپنے احمقوں کے ساتھ اپنی زبان سے نہیں بلکہ اپنے عمل کے ساتھ بڑا سنگدلانہ سلوک کرتا ہے۔ میں اس نتیجے پر بھی پہنچا ہوں کہ اشفاق احمد کے اندر ایک اقتدار پسند پیرو کرہٹ یعنی شائی افسر کہیں چھپ کر بیٹھا ہوا ہے۔ اس شائی افسر نے نہ تو اشفاق احمد کو پورا اویس بننے دیا ہے اور نہ پورا صوفی درویش بننے دیا ہے۔ بس وہ تصوف اور اویس کے درمیان لٹک کر رہ گیا ہے۔ لیکن جیسا کہ میں اس نقطے کی بار بار وضاحت کر چکا ہوں کہ مجھے اس کی دوستی عزیز ہے۔ میں چونکہ محبت کا آدمی ہوں۔ قدرتی طور پر میرے اندر اشفاق احمد کے لئے محبت پیدا ہو چکی ہے۔ اگر میرے دل میں یہ محبت نہ ہوتی تو یقین کریں میں اس کا دوست بھی کبھی نہ ہوتا۔ کیونکہ جتنی اس کے اندر کمزوریاں ہیں اس سے دلکی میرے اندر کمزوریاں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے محبت کا جذبہ عطا کر کے مجھ پر بڑا کرم کیا ہے۔ دوست میں نے جن کو بنایا وہ مجھ سے برتر نہ ہو گیا لیکن محبت جس سے کی ہے پھر وہ میری محبت کے اثر سے بچ نہیں سکا۔ یہی حال

اشفاق احمد کا ہے۔ جب میں اس کے سامنے جاتا ہوں تو اپنی محبت کو اس کے چہرے پر صاف دیکھ لیتا ہوں۔ اس وقت وہ بالکل بدلا ہوا آدمی ہوتا ہے۔ میری محبت اس کے دل کے کسی گوشے میں سونپی ہوئی محبت کو بیدار کر دیتی ہے۔ یقین کریں اس وقت اشفاق احمد دیکھنے کے لائق ہوتا ہے۔ مصیبت یہ ہے کہ زیادہ تر لوگ دوستیاں کرتے ہیں جس میں دماغ دماغ سے لڑتا ہے۔ محبتیں نہیں کرتے جس میں دل دل کے ساتھ مل جاتا ہے۔ جب کبھی اشفاق احمد سے ملتا ہوں تو میرا بھی یہی حال ہوتا ہے۔ محبت — محبت — صرف محبت! نہ کوئی غرض، نہ لالچ، نہ لینا نہ دینا۔ بس دیکھ کے خوش ہو جانا۔ باتیں کر کے خوش ہو جانا۔ جتنی دیر ایک دوسرے کے قریب رہنا خوش رہنا، نہال رہنا، کبیر داس نے شاید اسی کیفیت کو یوں بیان کیا ہے۔

کچھ لینا نہ دینا

مگن رہنا

دوستوں میں اس قسم کی محبت میں نے اشفاق احمد سے پہلے کرم نواز (بعد میں صرف نواز) سے کی ہے اور اشفاق احمد کے بعد کسی سے نہیں کی۔ ہوئی ہی نہیں۔ میں کیا کرتا۔ دوستی کرنا دکان کو سجا کر مال بیچنا ہے۔ محبت کرنا دکان کے مال کو لٹا دینا ہے۔ جیسے جیسے دکان کا مال لٹاتے جاؤ دن کی خوشی میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ منافع بڑھتا جاتا ہے۔ دکان خالی ہوتی جاتی ہے۔ دل بھرتا چلا جاتا ہے۔ چھپکے صفحوں میں میں نے اشفاق احمد کی جو دو ایک کمزوریاں یا برائیاں بتائی ہیں تو یہ میرے اندر بھی موجود ہیں اور یہ کمزوریاں مجھے محبت میں نظر نہیں آئیں۔ دوستی کی آنکھ سے دیکھا ہے تب نظر آتی ہیں۔ جب سے لوگوں کو پتہ چلا ہے کہ میں اشفاق پر کتاب لکھ رہا ہوں تب سے شمال، جنوب، مشرق، مغرب سے لوگ آ کر میرے کان بھر رہے ہیں۔ یہ بھی لکھنا کہ وہ — یہ بھی لکھنا — یہ ضرور لکھنا کہ — جو کوئی میرے پاس آ کر مجھے اس کی کوئی برائی یا کمزوری بتاتا ہے تو میں اسے کہتا ہوں کہ یہ برائی تو

میرے اندر بھی موجود ہے۔ میں کس منہ سے لکھوں؟ اس کی بعض کمزوریاں جو میں نے بیان کی ہیں وہ ایسی ہیں کہ میں اس کے منہ پر بھی کہہ سکتا ہوں۔ ایسی بات نہیں ہے کہ مجھے کتاب لکھنے کا موقع ملا ہے تو میں اس کی عدم موجودگی میں اس کے کچے چٹھے پھولنے شروع کر دوں۔ کون ہے جس میں صیب نہیں ہوتے دیکھنے والی چیز تو یہ ہوتی ہے کہ ایک انسان کے اندر اللہ کی مخلوق کے ساتھ محبت کتنی ہے۔ اشفاق احمد میں لاکھ کمزوریاں سہی، لاکھ اپنے ماتحتوں کے ساتھ ضابطے کی سخت کارروائی کرنے، مگر اس کے دل میں اللہ کی مخلوق کے لئے محبت کا بڑا قیمتی سرمایہ موجود ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو وہ "گڈ ریا" اور "مہمان بہار" ایسی کتابیں نہ لکھ سکتا۔

کون لکھتا ہے ایسی کتابیں؟ کون پڑھتا ہے ایسی کتابیں؟ میں نے ایک دفعہ اشفاق سے کہا تھا۔ کتابیں لکھ کر بھول جایا کرو۔ مگر وہ نہیں بھولتا۔ اس کے اندر ایک یہ بھی بڑی کمزوری ہے۔ وہ اپنی کمائی کا پیچھا کرتا ہے۔ جہاں جہاں کمائی جاتی ہے اس کے پیچھے پیچھے جاتا ہے۔

اس زمانے میں جو کہ لاہور میں شعرو ادب کے عروج کا زمانہ تھا مال روڈ پر ایک چھوٹا سا بڑا رومائیک ریسٹوران کھلا تھا جس کا نام بھی فرانسیسی میں شالٹ یا شالے تھا۔ اب یہ فریج جلنے والے جانیں کہ فرانسیسی میں اس کا تلفظ کیا ہوتا ہے۔ زبان بھی انسانوں کے درمیان ایک حجاب ہے۔ کیسے کیسے حجاب بچ میں آن چڑھے ہیں۔ بہر حال اس ریسٹوران میں ایک چھوٹی سی شاہ نصیرین یا ڈبہ نما کمرہ تھا جس کی ایک ہی کمری تھی جو مال روڈ پر کھلتی تھی۔ اس ریسٹوران میں چائے کی بجائے کافی ملتی تھی اور کافی بھی برازیل کی — یہ میں سن 1950ء کی بات کر رہا ہوں۔ اس وقت میں نے برازیل کے مک کو دنیا کے نقشے پر ہی دیکھا تھا اور اس کی کافی ہندوستان کے شہر گوا میں ایک دو بار پی تھی۔ وہاں یہ کافی پر نگالی اپنے ساتھ لائے تھے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ برازیل میں بھی یہ کافی پر نگال کے لوگ ہی لے کر آئے تھے۔ مال روڈ والے شالٹ کی

کافی کم از کم لاہور کے کافی ہاؤس سے بڑی اچھی ہوتی تھی۔ کافی ہاؤس کی کافی بڑی تیلی اور کم تر درجے کی کافی ہوتی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کافی ہاؤس میں بیٹھے والوں میں کافی کا شعور نہ ہونے کے برابر تھا۔ اگر لاہور کے کافی ہاؤس والے ہندوستان کے شہر مدارس میں جا کر وہاں کے دانش وران کو ایسی کافی پلاتے تو انہیں دوسرے دن ہی پوریہا ہسٹر کول کر کے وہاں سے بھاگنا پڑتا۔ کیونکہ مدارس کا قلی بھی ہم سے زیادہ ہسٹر اور اچھی کافی چٹا ہے اور کافی کا ہسٹر شعور رکھتا ہے۔ میں چونکہ پاکستان بننے سے پہلے پہلے مدارس "کیرالہ اور گوا" دمن کے ریسٹورانوں میں بیٹھ کر موسلا دھار بارش کے پس منظر میں وہاں کی کافی اور کو کو پی چکا تھا اس لئے مجھے پہلے روز سے ہی لاہور والے کافی ہاؤس کی کافی تلی اور غیر معیاری گلی تھی اور سخت مجبوری کی حالت میں وہاں کافی چٹا تھا۔ لاہور والے کافی ہاؤس میں اصلی اور نقلی دانشور محض فیشن کے طور پر کافی پیجے تھے۔ وہ کافی کو بالکل چائے کی طرح پیتے۔ یعنی بیٹھے ہیں اور کافی پر کافی پے جا رہے ہیں۔ ان میں سے کوئی نہیں سوچتا تھا کہ یہ مشروب صرف مرطوب یا سخت سرد ملکوں کے لئے ہوتا ہے۔ چنانچہ کافی ہاؤس کے اکثر دانشوروں نے کافی پی پی کر اپنے معدوں کو تباہ کر دیا۔ تاجر کاظمی کو اس کافی ہاؤس کی کافی پی پی کر معدے کا الہر ہوا تھا۔ اگر ہاہر برف نہ گر رہی ہو اور جنوب مشرقی ایشیا کی موسلا دھار مرطوب موسموں والی بارشیں نہ ہو رہی ہوں تو کافی کے پیالے پر پیالے پئے جانا شراب پینے سے زیادہ خطرناک بات ہوتی ہے۔

میں مال روڈ والے ثالث ریسٹوران کی کافی کی بات کر رہا تھا۔ اس ریسٹوران کا نام صرف ثالث تھا۔ ریسٹوران اسے میں نے لکھ دیا ہے۔ یہاں کھانا نہیں ملتا تھا۔ صرف "مینکس" تیار ہوتے تھے اور کافی ملتی تھی۔ میں اور اشفاق کبھی کبھی اس ریسٹوران میں جا کر کافی پیا کرتے تھے۔ وہ سردیاں ہوں یا گرمیاں وہ یہاں میری زیر نگرانی کافی چٹا تھا اور ہم کریم وال کر کافی پیتے

۔ ہمارے شہر کے موسموں کے لئے کریم کافی کا لازمی جز ہے۔ ہوا نشور ان کا کاخیاں نہیں رکھتے ان کی دانش پر میں نے کبھی اعتبار نہیں کیا۔ لاہور میں برف تو نہیں گرتی لیکن یہاں سردیوں کی بارش بڑی مائیک ہوتی ہے۔ مال روڈ والے فرانسیسی ثالث میں ہم کو شش کرتے کہ وقت کافی چٹے جو کہیں جب بارش ہو رہی ہو۔ خواہ یہ بارش موسم برسات بارش ہی کیوں نہ ہو۔ برسات کا موسم جنوبی مشرقی ایشیا کے ہاؤس کے لوگوں سے شروع ہوتا ہے۔ وہاں وہ جوان اور سرسبز شاداب ہوتا ہے۔ در تک آتے آتے وہ بوڑھا ہو جاتا ہے۔ جنٹوں نے ملایا "تھائی لینڈ" سنگا پور، رگون، کلکتہ اور کوئٹہ کے جنگلوں کی بارشیں دیکھی ہوتی ہیں وہ لاہور اور جرنوالہ کی برسات کو دیکھ کر صرف آپہن ہی بھر سکتے ہیں۔ مال روڈ والے ثالث کے کیمین میں ایک لکڑی کا ٹکڑ زینہ جاتا تھا۔ با اور اشفاق احمد کیمین کی چھوٹی سی کھڑکی والی میز کے پاس بیٹھ جاتے بارش مال روڈ کا نظارہ بھی کرتے اور کریم والی کافی کا بھی مزہ لیتے۔ اس وقت میں کوہ مری کا میز ریسٹوران بہت یاد آتا۔ آزاد کشمیر ریڈیو کے زمانے میں نے وہاں بر بناری کا ایک سیزن ایک ساتھ گزارا تھا۔ اس وقت پاکستان کی ایک سال سے بھی کم تھی۔ کوہ مری میں اتنی آبادی کہاں تھی۔ گرمیوں میں دڑی رونق ہوتی تھی۔ بر بناری کے زمانے میں تو بالکل ہی خالی ہو جاتا تھا۔ بناری میں ہم لمبے گرم کوٹ پہنے چھڑیاں ہاتھ میں لئے گرتی برف میں بہی میر کرتے۔ سبز ریسٹوران کے مالک سلطان صاحب نے خاص طور پر ریسٹوران سردیوں میں بھی کھلا رکھا تھا۔

ایک روز کوہ مری میں بڑی زبردست برف گر رہی تھی۔ سارے درخت، مکانوں کی چھتیں، سڑکیں برف سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ سمندر کے بحری جہاز تباہ و برباد کے تمام شیشے والی کھڑکیاں بند تھیں۔ میں اور اشفاق لکڑی کی سیڑھیاں چڑھ کر ریسٹوران میں آگئے۔ باہر سخت سردی تھی۔ برف گر رہی تھی۔ ساتھ ہوا بھی چل رہی تھی جو بڑی بج آلود تھی۔ ریسٹوران کی فضا گرم تھی۔ بخاری میں آگ دکھ رہی تھی۔ سلطان صاحب حسب معمول اپنی کونے والی سیٹ پر کھڑکی کے پاس بیٹھے تھے۔ ہمیں دیکھ کر مسکرائے۔ دور سے ہاتھ کے اشارے سے ہم نے ایک دوسرے کو سلام کیا۔ ہم دوسرے کونے والی میز پر بیٹھ گئے۔ بند کھڑکی کے شیشوں پر بھاپ جم رہی تھی۔ ہم بار بار دھال سے بھاپ کو صاف کرتے تو سڑک کا منظر صاف ہو جاتا۔ برابری میں کوئی کوئی مقامی آدمی لاکھی ٹیکتا سڑک پر سے گزر جاتا۔ ریسٹوران کے سامنے اونچے ٹیرس پر ایک کونٹھی کے پہلو میں چھوٹی سی انٹیکسی تھی۔ انٹیکسی کی ڈھلواں چھت سفید برف میں چھپی ہوئی تھی۔ برآمدہ خالی اور ویران تھا۔ سامنے چھوٹے سے لان میں بھی برف کی چادر بچھی ہوئی تھی۔ میں اور اشفاق باتیں کر رہے تھے۔ اتنے میں وینر ہمارے لئے کریم کافی لے آیا۔ اشفاق کافی بنانے لگا۔ میری نگاہیں باز بار ٹیرس والی انٹیکسی کی طرف اٹھ جاتیں۔ اس کی ایک خاص وجہ تھی۔ وجہ یہ تھی کہ تھوڑی دیر پہلے میں نے وہاں پر ایک لڑکی کو دیکھا تھا جس نے بلیو شلوار قمیض کے اوپر سرخ رنگ کا ہاف کوٹ پہن رکھا تھا۔ وہ کمرے کا دروازہ کھول کر برآمدے میں آئی تھی۔

اس نے چھوٹی سی نوکری برآمدے میں ستون کے ساتھ رکھی اور برف کے چھوٹے چھوٹے سفید پھولوں کو گرتے دیکھنے لگی۔ پھر وہ جلدی سے کمرے میں چلی گئی اور کمرے کا دروازہ بند ہو گیا۔

میرا خیال تھا کہ انٹیکسی خالی ہوگی۔ برابری میں کون پہاڑ پر آتا ہے۔ مگر لڑکی کو دیکھا تو طبیعت خوش ہو گئی کہ دنیا میں باذوق لڑکیاں ابھی باقی ہیں۔ میں نے اشفاق کو نہ بتایا کہ ابھی ابھی میں نے ویران ٹیرس والی انٹیکسی میں ایک لڑکی کو دیکھا ہے۔ وہ لڑکی لباس سے پڑھی کھٹی لگ رہی تھی اور صاف لگ رہا تھا کہ وہ اپنی فیملی کے ساتھ پہاڑ پر برابری کا نظارہ کرنے آئی ہوئی ہے۔

جس وقت اشفاق نے کافی بنا کر میری طرف بڑھائی تو میں اسی ٹیرس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اشفاق میری نظروں کو پہچان لیتا ہے۔ اس نے بھی ایک نگاہ اوپر خالی ٹیرس پر ڈالی اور پوچھا۔
"اوجھ کیا دیکھ رہے ہو؟"

میں نے کہا۔ "برابری دیکھ رہا ہوں۔"
وہ مسکرایا۔ "کیسے ضرور کوئی بات ہے۔ کیا وہاں کوئی لڑکی نظر آئی ہے؟"

میں نے کہا۔ "اس برابری میں اتنی شدید سردی میں یہاں کون آتا ہے۔"

عین اسی وقت وہی لڑکی دروازہ کھول کر دوبارہ برآمدے میں آئی۔ اس بار اس کے ساتھ ایک عورت بھی تھی جو بھاری بدن کی تھی۔ اشفاق فوراً بولا۔

"کیسے میں نہ کتا تھا کوئی بات ضرور ہے۔"

پھر وہ مجھے ڈانٹنے اور بہا لیاٹ ویسے لگا۔

"خبردار! جو یہاں کوئی ایسی دبی حرکت کی۔ ہم لوگ یہاں ایک

بھٹل کار کے لئے کام کرنے آئے ہوئے ہیں۔ ہمیں اپنے بھٹل کار کی اینگلیزٹی کا خیال رکھنا ہو گا۔“

میں نے ہلکے آکر کہا۔

”میں نے کسی کا کھیس نہیں کاٹا۔ برہماری میں ایک کاسنی لباس والی لڑکی کو دیکھا ہے جو مجھے اچھی لگی ہے۔“

اشفاق سر ہلاتے لگا۔

”شروع شروع میں تم یہی کہا کرتے ہو۔ میں تیری ایک ایک رگ سے واقف ہوں۔“

میں نے گرتی برف کی جھال میں سے ٹیرس کی طرف دیکھا۔ وہاں دونوں عورتوں میں سے کوئی بھی نہیں تھی۔ میں نے اشفاق سے کہا۔

”اب تو خوش ہو۔ برآمدہ خالی ہے دیکھ لو۔ وہاں کوئی نہیں ہے۔“

اتنے میں سبز کے مالک سلطان صاحب بھی اٹھ کر ہمارے پاس آگئے اور سیاست پر باتیں شروع ہو گئیں۔ سیاست سے مجھے ذرا بھی دلچسپی نہیں تھی۔ اشفاق سیاست پر فوب باتیں کرنے لگا۔ میں اس کی نظرس بچا کر تھوڑی تھوڑی دیر بعد اوپر انیکسی کے برآمدے کی طرف دیکھ لیتا تھا۔ مگر وہ کاسنی سوٹ والی لڑکی پھر نظر نہ آئی۔ ہم کافی دیر ریسٹوران میں بیٹھے رہے۔ پھر گرتی برف میں ہی ریسٹوران کی سیڑھیاں اتر کر سڑک پر آگئے اور واپس اپنے کواٹروں کی طرف روانہ ہو گئے۔

برہماری کے سینڑن میں مری کی فیشن سڑکیں خالی خالی تھیں۔ مال کی دکانیں بھی بند تھیں۔ مگر لوڑ بازار میں دکانیں کھلی تھیں۔ یہ مقامی لوگوں کی دکانیں تھیں۔ سارا دن وہاں مقامی لوگوں کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ میرے پوٹ کا ایک قلمہ نوٹ گیا تھا۔ میں قلمہ لینے لوڑ بازار میں ایک خیاری کی دکان پر کھڑا تھا کہ مجھے سے دو عورتیں اوپر آئی نظر آئیں۔ ان کے لباس سے لگ رہا تھا کہ وہ مقامی نہیں ہیں۔ ان میں سے ایک بھاری بدن کی عورت تھی اور

ایک دبلی پتلی لڑکی تھی۔ لڑکی نے کاسنی سوٹ پہنا ہوا تھا۔ ابھی وہ دور ہی تھیں کہ میرے دل کی دھڑکن کچھ تیز ہو گئی۔

میرے دل نے کہا۔ یہ کاسنی سوٹ والی واقعی ٹیرس والی لڑکی ہے۔ میں تسے دسے لیتا بھول گیا۔ وہ میرا آوارہ گردیوں اور آوارہ مزاجیوں کا زمانہ تھا۔ سڑک پر برف جمی ہوئی تھی۔ دونوں عورتیں بڑی احتیاط سے چڑھائی چڑھ رہی تھیں۔ ہوا بند تھی۔ برف نہیں گر رہی تھی۔ اب وہ میرے قریب سے گزرنے لگیں تو میں لڑکی کے قد کاٹھ اور کاسنی لباس سے اس نتیجے پر پہنچ کہ یہ وہی ٹیرس والی لڑکی ہے۔

دونوں کے مابین پھول رہے تھے اور وہ کسی بات پر ہنس رہی تھیں۔ قریب سے گزرتے ہوئے اس لڑکی نے یونہی ایک نظر مجھ پر ڈالی اور دونوں عورتیں جمی ہوئی برف پر سنبھل سنبھل کر چڑھائی چڑھیں آگے نکل گئیں۔ میری نگاہ دھوکا نہیں کھا سکتی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ یہ وہی ٹیرس والی لڑکی ہے۔ اس نے سرخ ہاف کوٹ کی بجائے نل سلیويز اور بند ٹگے والا گمراہیو سوٹر پہنا ہوا تھا۔

میں انہیں جاتا اوپر دیکھ رہا تھا۔ اوپر پہنچ کر جب وہ ڈاک خانے والے چوک کی طرف مڑنے لگیں تو کاسنی سوٹ والی لڑکی نے گردن موڑ کر میری طرف دیکھا اور پھر دوسری عورت کے ساتھ تیزی سے آگے نکل گئی۔ میرے دل کی دھڑکن ایک بار پھر تیز ہو گئی۔ وہ نوجوانی کا دور تھا۔ وہ زمانہ ہی دل کی دھڑکنوں کے شمار کا زمانہ ہوتا ہے۔ آخر عمر میں جا کر پھر آدمی کی دھڑکن اچانک تیز ہو جائے تو وہ ڈر جاتا ہے اس کا رنگ اڑ جاتا ہے کہ کہیں مجھے ہارٹ اٹیک تو نہیں ہونے والا۔ جوانی میں دل دوسرے کے دل پر اٹیک کرتا ہے۔ آخری عمر میں خود اس پر اٹیک ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ جوانی کی ساری فرمستیاں پھر آخری عمر میں آکر نکلتی ہیں۔ اسی لئے سب کچھ ہیں کہ آدمی جوانی میں اپنے آپ کو سنبھال کر رکھے تو آخری عمر بڑے آرام سے

گزرتی ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ آرام ہے کیا چیز؟ بعض لوگوں کو دل کے درد میں آرام ملتا ہے۔ مگر میرا خیال ہے کہ یہ شاعرانہ بات ہے۔ محبت میں جو دل کا درد ہوتا ہے اس کا احساس تک نہیں ہوتا۔ اصل دل کا درد جو ہوتا ہے اس سے خدا بچائے۔ آدمی ساری محبت و غمرو بھول جاتا ہے۔

مگر میری عمر ایسی باتیں سوچنے کی نہیں تھی۔ میں فوراً اس لڑکی پر عاشق ہو گیا۔ میں نے اسے اپنے خیالوں کی مجاہدہ بتایا اور بڑا خوش ہوا کہ چلو میرا بڑبڑادی میں ایک روائے بھی شروع ہو گیا۔ اس رومانیک خیال نے ہی میرے وجود کو ایک آسمانی لذت اور روحانی سرور سے لہریز کر دیا۔ اب میں ایسے طریقے سوچنے لگا کہ اس لڑکی سے دوبارہ ملاقات کی جائے۔ میں نے اشفاق سے اس کا ذکر نہ کیا۔ دوسرے روز ایسا اتفاق ہوا کہ اس لڑکی سے ایک بار پھر آسمان سامنا ہو گیا۔ کوہ مری کی میونسپل لائبریری بھی بربادی کے یزین میں اپنے اوقات کے مطابق کھلی رہتی تھی۔ میں لائبریری کی نیم گرم فضا میں بیٹھا ایک رسالہ دیکھ رہا تھا کہ وہی لڑکی لائبریری میں داخل ہوئی۔ میں ایسے زاویے پر بیٹھا تھا کہ اس کی نظر مجھ پر نہ پڑی۔ میں نے اسے دیکھ لیا تھا۔ وہ سیدھی لائبریری کے پاس جا کر باتیں کرنے لگی۔ وہ کسی انگریزی فلمی رسالے کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔ لائبریری نے اسے الماری میں سے رسالہ نکال کر دیا۔ وہ رسالہ ہاتھ میں لئے واپس مڑی تو اس نے مجھے بیٹھے دیکھا۔ میں بھی اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مجھے تو دیکھنا ہی تھا۔ اس کے سوا وہاں دیکھنے کی اور چیز ہی کوئی تھی۔

میں نے محسوس کیا کہ وہ ایک لمحے کے لئے ٹھٹک سی گئی۔ بلکہ میز کی طرف جاتے جاتے رک گئی۔ اس وقت مجھے خیال آیا کہ ہو سکتا ہے اس نے مجھے پہچان لیا ہو۔ کیونکہ ”ادب لطیف“ اور ”سور“ رسالوں میں میرے تین چار افسانے چھپ کر شہید ہو چکے تھے اور ادب لطیف میں میری ایک تصویر بھی چھپی تھی۔ وہ لڑکی رسالہ ہاتھ میں لئے میری طرف آئی۔ میں سنبھل کر

بٹھ گیا۔ آخر وہی بات نکلی۔ اس نے مجھے پہچان لیا تھا۔

”کیا آپ اے حمید ہیں؟“ پھر وہ میرے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گئی اور میرے افسانے ”منزل منزل“ کے متعلق باتیں پوچھنے لگی۔

”کیا آپ کو واقعی ”منزل منزل“ کی ہیروئن راجدہ سے محبت تھی؟“

میں نے جھوٹ بولا۔

”نہیں اتنی محبت نہیں تھی۔ بس ساتھ ساتھ رہنے سے محبت ہو ہی جاتی ہے۔“

میں اگر یہ جھوٹ نہ بولتا تو پھر میرے لئے اسے یہ کہنے کی محجاش نہیں رہتی تھی کہ مجھے تم سے محبت ہے اور تم دنیا میں پہلی لڑکی ہو جس سے میں نے محبت کی ہے۔ کیا کروں؟ یہ جھوٹ بولنا ہی پڑتا ہے۔ اصل میں دیکھا جائے تو یہ محبت و غمرو بھی جھوٹ موٹ کا کھیل ہوتا ہے۔ اس میں ایسا پردہ کرتا ہے کہ پھر کچھ دکھائی نہیں دیتا۔

اس لڑکی کو یہ سن کر بڑا صدمہ ہوا۔ میری طرف پلکیں جھپک جھپکا کر دیکھنے لگی۔ بولی۔

”تو آپ نے یہ سب کچھ جھوٹ لکھا تھا؟ نہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔“

کم از کم ایک ادیب کو جھوٹ نہیں لکھنا چاہیے تھا۔

اس دوران میں نے اس کا اچھی طرح سے جائزہ لے لیا تھا۔ کچھ وقت کے لئے محبت کرنے کے واسطے وہ بڑی موزوں لڑکی تھی۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ دو چار ملاقاتوں کے بعد اس سے اظہار محبت کروں گا۔

”آپ کوہ مری میں کہاں ٹھہرتے ہوئے ہیں؟“

میں نے اپنی جگہ بتائی تو وہ بولی۔

”میں اپنی آغی کے ساتھ کیمپل سینا کے پاس کالج کی انگیسی میں ٹھہری ہوں۔“

میں نے اسے یہ بالکل نہ بتایا کہ میں وہاں اسے پہلے بھی دیکھ چکا ہوں۔

لڑکی ہوی اچکچوہیں ٹاپ کی تھی۔ بس یہی ایک مصیبت تھی۔ ایسی لڑکیاں عام طور پر بڑی بوری ہوتی ہیں۔ مگر یہ بات حوصلہ افزا تھی کہ وہ گھنگو بڑی ولفریب انداز میں کرتی تھی اور اس کا ٹپلا ہونٹ بڑا خوبصورت تھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے کسی یونانی سنگتراش نے یا قوت میں سے تراشا ہو۔ اس کا اصلی نام میں نہیں لکھوں گا۔ آپ شرمیلا سمجھ لیں۔ وہ کہہ رہی تھی۔

”کوہ مری کا اصل لطف پر غباری کے سیزن میں آتا ہے۔ جولائی، اگست میں تو یہاں میلہ لگا ہوتا ہے۔ اس موسم میں مری اپنا حسن چھپا لیتی ہے۔“

وہ لڑکی بھی مجھ سے اپنا بہت ماحسن چھپا رہی تھی لیکن میں نے اس کے حسن کو بے نقاب کرنے کا پختہ عزم کر رکھا تھا میں کیا کرتا۔ وہ عمری ایسی تھی۔ وہ اردو افسانے پر باتیں کرنے لگی۔ معلوم ہوا کہ وہ راولپنڈی کے ایک کالج میں پڑھتی ہے اور اردو ادب اس کا پسندیدہ سبیکٹ ہے۔ افسانہ نگاروں میں اشفاق احمد کا ذکر بھی آیا۔ یہاں میں نے اپنے پاؤں پر آپ کٹاڑی مارنے ہوئے اسے بتایا کہ اشفاق احمد بھی میرے ساتھ ہی رہتا ہے۔ اس پر وہ خوشی کے مارے کرسی پر اچھلی پڑی۔

”کیا واقعی؟ اشفاق صاحب بھی مری میں ہیں؟“

اشفاق کے لئے اس کا اس قدر اشتیاق دیکھ کر میں جل بھن گیا۔ مگر اب میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ مجھے کہنا پڑا۔

”ہاں“ وہ میرے ساتھ ہی کوہ مری آیا ہے۔ شاید آج یا کل صبح واپس لاہور چلا جائے۔“

اب میں اشفاق احمد کو ہر قیمت پر راستے سے ہٹانا چاہتا تھا مگر وہ لڑکی یعنی شرمیلا تو اشفاق کی گردیدہ تھی۔ کہنے لگی۔

”میں آپ کا احسان کبھی نہ بھولوں گی پلیز مجھے ایک بار اشفاق صاحب سے ملا دیجئے۔ اشفاق احمد میرے پسندیدہ رائٹر ہیں۔ بس“

میں انہیں ایک بار صرف ایک بار اپنے سامنے دیکھنا چاہتی ہوں۔“

میں نے سینے پر ہتھ رکھ کر کہا۔

”یہ کوئی مشکل بات ہے۔ آپ آج شام یہ ساتھ والے سبز ریسٹوران میں آجائیں۔ میں اشفاق کو لے کر آجاؤں گا۔“

لڑکی بے تاب ہو رہی تھی۔ کہنے لگی۔

”ابھی ان سے ملاقات نہیں ہو سکتی؟“

میں دل میں اشفاق کو گالیاں دینے لگا۔ لڑکی سے کہا۔

”ابھی تو شاید وہ سو رہا ہو گا۔ چار بجے میں اسے لے آؤں گا۔“

”ہائے چار بجے تک میں کیسے انتظار کروں گی۔“

اب مجھے اس لڑکی پر بھی غصہ آنے لگا۔ میں نے دل میں اسے بھی گالی دی اور اوپر سے بڑی شائستگی سے کہا۔

”چار بجنے میں تین چار گھنٹے ہی باقی ہیں۔“

اب اس لڑکی نے اشفاق کی ان کہانیوں کی باتیں شروع کر دیں جو ”ادب لطیف“ میں حال ہی میں چھپی تھیں۔ مجھے اور زیادہ غصہ آ رہا تھا۔ اوپر سے میں مسکرا مسکرا کر ہوں ہاں کرتا جاتا تھا۔ پھر وہ چلی گئی۔ ٹھکر جاتے جاتے مجھے بار بار یہی کہتی رہی۔

”پلیز! اشفاق صاحب کو ضرور لائیے گا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ واپس

لاہور چلے جائیں اور میں ان سے ملنے کی حسرت ہی لے کر یہاں سے جاؤں۔“

میں نے دل میں کہا۔ اب دفع بھی ہو جاؤ۔ مگر اوپر سے کہا۔

”فکرنہ کرو۔ اشفاق صاحب کو میں لے آؤں گا۔“

وہ چلی گئی اور میں نے دریا میں مچھلی پکڑنے کے لئے جو کنڈی ڈالی تھی اسے باہر نکال لیا۔ یہ مچھلی اشفاق کے کانٹے میں پسلے ہی سے پھنسی ہوئی تھی اور میرا یہ اصول رہا ہے کہ میں دوسرے کا مارا ہوا شکار کبھی نہیں کھاتا۔

اشفاق کو اثر میں ہی تھا۔ میں نے برا سامنہ بنا کر کہا۔

"اوتے ایک فنسول سی بد شکل سی کوڑ مغز لڑکی تم سے ملنا چاہتی

ہے۔ چار بجے میرے ساتھ سمز ریسٹوران میں چلتا۔"

میں نے یہ بتایا ہی نہیں کہ یہ وہی میرس والی لڑکی ہے۔ اشفاق حسب

معمول لڑکی کے ذکر پر شرمایا۔ میں نے اسے جھاڑتے ہوئے کہا۔

"لڑکیوں کی طرح شرمنا تھا تو افسانے کیوں لکھے تھے؟ کس نے کہا تھا

افسانے لکھو؟ لڑکی تمہاری بڑی زبردست مداح ہے مگر بڑی پور

انٹیکلچرل قسم کی ہے بس جس طرح تم پور ہو بالکل ویسی ہی ہے۔"

اشفاق شرماتا رہا۔ مسکراتا رہا اور بار بار کان کھاتا رہا۔ میں غصے میں

فرش پر پڑی ہوئی چیزوں کو ٹھنڈا مارتا اپنے بستر پر جا کر لحاف اوڑھ کر لیٹ گیا۔

اشفاق نے کہا۔

"تم سونے لگے ہو۔ سمز نہیں جانا چار بجے؟"

میں نے لحاف میں سے منہ نکال لیا اور اشفاق کی طرف دیکھا۔

"واہ واہ! ابھی سے عشق کا بھوت سوار ہو گیا ہے۔ میں سوتا ہوں۔"

چار بجے اٹھا دیتا۔"

چار بجے میں اشفاق کو لے کر سمز ریسٹوران پہنچ گیا۔ آسمان آبدار

تھا۔ ڈاک خانے کے چوک سے لے کر ابھنسی تک مال روڈ بالکل خالی تھی۔

ایک دھند سی اتر رہی تھی۔ صاف لگتا تھا کہ برقیاری ہوگی۔ سردی بہت زیادہ

تھی۔ ہوا بھی بڑی برقی چل رہی تھی۔ میں نے اشفاق کے قریب ہو کر کہا۔

"یہ لڑکی تمہاری زبردست مداح ہے۔ بلکہ تم سے بے حد محبت

کرتی ہے۔ مگر یاد رکھو وہ اپنی زبان سے کبھی محبت کا اظہار نہیں

کرتی گی۔ یہ کام تمہیں کرنا پڑے گا۔ کرلو گے؟"

اشفاق نے مجھے جھاڑتے ہوئے کہا۔

"تم خواہ خواہ ہر بات پر رومانس کا کوٹ پھیرنا شروع کر دیتے ہو۔ کیا

محبت کے بغیر ہم کسی خاتون سے نہیں مل سکتے۔ وہ میری مداح ہے۔

تمہاری بھی مداح ہے۔ اس کے ساتھ بیٹھ کر کافی پیئیں گے۔ باتیں

کریں گے۔ اچھا وقت گزاریں گے اور واپس آجائیں گے۔ کیا یہ

ضروری ہے کہ اس کے سامنے میں اعلیٰ بن کر محبت کے ڈائیلاگ

بولنے شروع کر دوں۔ کیئے! کبھی رومانس کی عینک اتار کر بھی لوگوں

کو دیکھ لیا کرو۔"

میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے تم اگر اس موقع سے بھی فائدہ نہیں اٹھانا چاہتے تو نہ

سمز۔ میں تو اس لئے کہہ رہا تھا کہ یہ رومانس تمہارے افسانے کو

چار چاند لگا دے گا۔"

اشفاق احمد بولا۔

"میرے افسانے کو جو ایک دو چاند لگے ہوئے ہیں وہی کافی ہیں۔"

مال روڈ پر درمیان میں سے برف پٹا دی گئی تھی۔ اب صرف سڑک

کے کنارے برف کی ڈیریاں گچی تھیں۔ ہم دونوں سڑک کے درمیان چل

رہے تھے۔ کیپٹل سینما کی پتھر ملی دیوار کے اوپر چڑھ کر درخت سرسئی بادلوں

میں گھم رہے تھے۔ یہ بادل برف لا رہے تھے۔ مال روڈ پر اندھیرا سا چھا

گیا۔ اشفاق خاموشی سے چل رہا تھا۔ ہم سمز ریسٹوران میں آ کر بیٹھ گئے۔

اس وقت چار بج کر دس منٹ ہوا تھے۔ سمز کا لمبا جھازی کمرہ تقریباً خالی

تھا۔ کونے میں ایک گلاب اور کوٹ کے کالر چھائے کھڑکی کے قریب بیٹھا

شیشوں میں سے سڑک پر چھائے ہوئے سرسئی بادلوں کا منظر دیکھ رہا تھا۔ یہ

سرسئی بادل دھوکے کی طرح آگے بڑھ رہے تھے۔ درمیان میں بخارچی سنگ

رہی تھی مگر سردی اس قدر زیادہ تھی کہ صرف بخارچی کے اوپر سردی گرمانش

محسوس ہوتی تھی۔

میں نے کھڑکی کے دھندلے شیشے کو ہاتھ سے صاف کرتے ہوئے اوپر

میرس کی طرف دیکھا۔ وہاں بھی دھند اور بادل چھا رہے تھے۔ مجھے انہی کا
برآمدہ وغیرہ کچھ نظر نہ آیا۔ میں نے میرے کو کریم کافی کا آرڈر دیتے ہوئے
اشفاق سے کہا۔

”میرا خیال ہے اس خراب موسم میں وہ لڑکی شاید بگھر سے نہ
نکلے۔“

اشفاق بولا۔

”ہو سکتا ہے نہ آئے۔ میں صرف اس کی خاطر نہیں آیا۔ میں تو
اس سرد ویران پر فیلے موسم میں کافی پیئے آیا ہوں۔“

”اسی لئے میں نے کافی کا آرڈر دے دیا ہے۔“

دل سے میں بھی یہی چاہتا تھا کہ وہ لڑکی نہ ہی آئے۔ مجھے اب اس لڑکی
سے کسی قسم کی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ میں بھی کتنا خود غرض تھا۔ جب تک وہ
لڑکی میری دوستی کی باتیں کرتی رہی میں اس کے ساتھ رہا۔ اس کا دم بھرتا رہا۔
جو خفی اس نے کسی دوسرے لڑکے سے دلچسپی لینی شروع کی میں اسی کے خلاف
ہو گیا۔ شاید یہ انسان کی بلکہ مرد کی فطرت بھی ہے۔ شاید بچہ بھی یہی چاہتی
ہے۔ میں بار بار لڑکی کے شیشے کو صاف کر کے بیچے ہال پر نگاہ ڈالتا کہ وہ لڑکی تو
نہیں آ رہی۔ آخر وہ مجھے نظر آگئی۔ اس نے گزرم جیکٹ پہن رکھی تھی۔ وہ
دونوں ہاتھ جیکٹ کی جیبوں میں دیئے اوپر ڈاک خانے کی طرف سے آ رہی
تھی۔ میں نے اشفاق سے کہا۔

”لو بھائی! وہ آ رہی ہے۔ اچھا ہوا میرا ابھی تک کافی نہیں لایا۔“

اشفاق نے گردن موڑ کر پیچھے دیکھا۔ لڑکی سمبز کا زینہ چڑھ رہی تھی۔
میں اٹھ کر زینے کے پاس چلا گیا۔ لڑکی کا چہرہ سردی کی وجہ سے سرخ ہو رہا
تھا۔ میں نے کہا۔

”میرا خیال تھا موسم خراب ہو گیا ہے شاید آپ نہ سہیں۔“

وہ ہنس پڑی۔

”آپ رومانوی افسانہ نگار ہو کر اس موسم کو خراب کہہ رہے ہیں۔
یہ تو میری کاسب سے خوبصورت موسم ہے۔“

میں اسے لے کر اپنی میز کی طرف بڑھا۔ اس نے اشفاق احمد کے
بارے میں پوچھا۔

”اشفاق صاحب آئے ہیں نا؟“

میں نے کہا۔

”جی ہاں! وہ بیٹھے ہیں۔“

اشفاق احمد تعلیم کے طور پر اٹھ کھڑا ہوا۔ لڑکی نے بے باکی کے ساتھ
اشفاق سے ہاتھ ملایا اور وہ اشفاق کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ میرا میرے
قرب سے گزرا تو میں نے اسے اشارے سے کہا کہ تین کافی لائے۔ وہ اثبات
میں مسکراتے ہوئے سر ہلا کر آگے نکل گیا۔

اشفاق احمد نے لڑکی سے باتیں شروع کر دیں کیونکہ اس کے دل میں
لڑکی سے محبت وغیرہ کا کوئی خیال نہیں تھا اس لئے وہ پوری آزادی اور بے
تکلفی سے باتیں کر رہا تھا۔ اگر لڑکی اسے یہ کہہ دیتی کہ مجھے تم سے محبت ہے
میں تم پر دل و جان سے عاشق ہوں تو پھر معاملہ الٹ ہو جاتا۔

لڑکی اشفاق احمد کے افسانوں کے بارے میں اس سے پوچھ رہی تھی کہ
فلاں افسانے میں اس نے جو فلاں جملہ لکھا ہے اس سے کیا مراد تھی۔ وغیرہ
وغیرہ۔ اس لڑکی کو اشفاق احمد کی کہانیوں کے جملے کے جملے یاد تھے۔ پھر لڑکی
نے اشفاق احمد سے میرے بارے میں پوچھا کہ اس کا میرے افسانوں کے
بارے میں کیا خیال ہے۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ میں اور ٹیل کالج کی اردو کی
کلاس میں بیٹھا ہوں وہ لڑکی مجھے بڑی خشک قسم کی دانشور لڑکی لگنے لگی تھی۔
میرا کافی رکھ کر چلا گیا۔

اچانک مال روڈ پر سرمئی بالوں میں سفید سفید برف کی ہتھکڑیاں
گرنے لگیں۔ میں نے اشفاق احمد سے کہا۔

”برق کرنے لگی ہے۔“

اشفاق احمد اور لڑکی دونوں نے ہاتس کرتے کرتے کھڑکی سے باہر دیکھا۔
باہر برف گر رہی تھی۔ میں نے کافی ہٹائی۔ کافی شاید اسی موسم کے لئے اسی
دن کے لئے، اسی برہنہ کی کے لئے قدرت نے بنائی تھی۔ سیاہ بادلوں کی وجہ
سے اندھیرا چھا گیا تھا۔ سمندر، ستوران کی تجلیاں روشن ہو گئیں۔ لڑکی نے کہا۔
”میرا خیال ہے کھڑکی کھول دیں۔ کہتے ہیں برہنہ کی کے وقت جو
ہوا چلتی ہے وہ کچھ نہیں کہتی۔“
مگر اشفاق نے کھڑکی نہ کھولنے دی۔

”بی بی! اندر گرنا کس ہے۔ باہر سردی ہے۔ کھڑکی کھول دی تو گرم
سرد ہو جائیں گے۔“

وہ موسم واقعی کھڑکی کھول کر بیٹھنے کا تھا۔ مگر اشفاق احمد کو اندیشہ تھا کہ
کسیں اس کو زکام وغیرہ نہ ہو جائے۔ حقیقت میں دیکھا جائے تو رومان اشفاق
احمد کے قریب سے بھی ہو کر نہیں گزرا۔ میں کسی لڑکی نے رومان کی بات
نہیں کر رہا۔ بلکہ نیچر کے رومان کی بات کر رہا ہوں۔ رومان اس کے مزاج کے
خلاف ہے۔ چونکہ یہ اس کے مزاج کا حصہ نہیں ہے اس لئے میں کبھی اس
کے ساتھ نیچر کے رومان کی باتیں نہیں کرتا۔ نیچر کے رومان کی دنیا ہی اور
ہے۔ یہ ملک ہی اور ہے۔ اس کی آب و ہوا ہی اور ہے۔ یہاں مجھے گوالہنڈی
کا ایک پہلوان یاد آ گیا ہے۔ اس پہلوان کی گوالہنڈی میں دودھ کی وکان تھی۔
حسن طارق نے مجھے بتایا کہ یہ پہلوان بڑی مزے دار باتیں کرتا ہے۔ اس کی
اپنی ڈکشن ہے۔ ذرا تم اس سے کوئی بات کر کے دیکھو۔ میں نے حسن طارق
سے کہا۔ ”کیا بات کروں؟“

حسن طارق نے کہا۔

”پہلوان کو موسیقی کا بڑا شوق ہے۔ ہمیں بھی موسیقی کا شوق
ہے۔ چلو موسیقی کے بارے میں اس سے کوئی سوال کرو۔“

ہم دونوں پہلوان کی وکان پر گئے۔ پہلوان دودھ کی بست بڑی کڑائی میں
کھینچ چلا رہا تھا۔ حسن طارق نے پہلوان سے کہا۔

”پہلوان بی بی! یہ میرے دوست ہیں۔ یہ آپ سے موسیقی کے

بارے میں کچھ پوچھنا چاہتے ہیں۔“

پہلوان کا چہرہ بڑا بھولا بھالا اور معصوم تھا۔ کہنے لگے۔

”پوچھو بی بی! ضرور پوچھو۔“

میں نے یونہی کہہ دیا۔

”پہلوان بی بی! یہ بتائیں کہ راگ مالکونس اور راگ بھیروں میں کیا

فرق ہے؟“

پہلوان نے ہنس کر کہا۔

”یہ کیا بات کر رہی ہے آپ نے باؤ بی بی! کہاں راگ مالکونس کہاں

راگ بھیروں۔ وہ ملک ہی اور ہے۔ آب و ہوا ہی اور ہے۔“

نیچر کے رومانس کے حوالے سے مجھ میں اور اشفاق احمد میں راگ

مالکونس اور راگ بھیروں کا فرق ہے۔ وہ ملک ہی اور ہے اس کی آب و ہوا

ہی اور ہے۔ مگر ہمارا ایک سر ضرور ملا ہوا ہے اور وہ ہے محبت کا سر۔ اسی سر

نے ہمیں ایک دوسرے سے ملا رکھا ہے۔ چونکہ سر ملے ہوئے ہیں اس لئے

ہماری محبت بے غرض ہے۔ بغیر لالچ کے ہے۔ ہمیں ایک دوسرے سے کچھ نہ

نیٹا ہے نہ دینا ہے۔ چاہے دو سال بعد ملیں۔ دونوں چپ ملتے ہیں تو پیار محبت

کی ہوا چلتے لگتی ہے۔ پیار محبت کی نفا قائم ہو جاتی ہے اور اسی پیار محبت کی

نفا میں ہم دوبارہ کئی سال بعد ملنے کے لئے جدا ہو جاتے ہیں۔ برف زیادہ

گرنے لگی تو وہ لڑکی جس کا فرضی نام میں نے شرمیلا بتایا تھا اٹھ کھڑی ہوئی۔

”اب میں جاتی ہوں۔ آنٹی پریشان ہو رہی ہوں گی۔ اچھا اشفاق

صاحب! پھر ملاقات ہوگی۔ آپ کل دونوں حضرات شام کی چائے

میرے ہاں کیوں نہیں پیٹے؟ میری آنٹی بھی بڑی ادب دوست ہیں۔“

وہ آپ دونوں سے مل کر بڑی خوش ہوں گی۔“
اشفاق کچھ ہنچکا رہا تھا۔ میں نے فوراً کہہ دیا۔
”ضرور آئیں گے۔ کتنے بچے آجائیں؟“
”میری چار بچے آجائے گا۔“

اشفاق بولا۔

”موسم زیادہ خراب ہوا تو شاید ہم نہ آسکیں۔“
میں نے کہا۔

”کوئی خراب نہیں ہوتا موسم۔ خراب بھی ہوا تو ہم اسے ٹھیک کر لیں گے۔“

وہ چلی گئی۔ ہم گرتی برف میں اسے ڈاک خانے کی طرف چڑھائی پر
سنبھل سنبھل کر چلتے دیکھتے رہے۔ اشفاق کہنے لگا۔

”بڑی ذہین خاتون ہے۔“

میں نے اس سے پوچھا۔

”کل شام اس کے ہاں چلو گے یا نہیں؟“

اشفاق شرما سا گیا۔

”یار! تم چلے جانا۔ میں کہاں جاؤں گا۔“

میرا خیال تھا کہ وہ دل سے نہیں کہہ رہا۔ مگر وہ دل سے کہہ رہا تھا۔
دوسرے دن مجھے اکیلے ہی شرمیلا کے ہاں چائے پر جانا پڑا۔ میں نے بڑا اصرار
کیا مگر اشفاق نہ مانا۔ یہی کہتا رہا۔

”یار! مجھے اچھا نہیں لگتا۔ ریڈیو کے لوگ خواہ مخواہ سینڈل بنا دیں
گے۔“

وہ ٹھیک کہتا تھا۔ اشفاق احمد کو ہمیشہ اپنی عزت نفس کا بڑا خیال رہتا ہے
اور یہی وہ بات ہے جس نے اسے اس کی ادبی حیثیت کے علاوہ معاشرے میں
ایک باعزت مقام عطا کیا ہے۔ اشفاق احمد کی دوسری خوبیوں کے ساتھ ساتھ

اس کی اس خوبی پر بھی رشک کرتا ہوں۔ عزت نفس کا جو شخص بھی احترام
رے میں اس پر رشک کرتا ہوں اور اشفاق میں یہ وصف بدرجہ اتم موجود
ہے۔ میرے دل میں اشفاق کے لئے جو محبت ہے اس میں اس کے اس وصف
بھی بڑا دخل ہے۔

میں اکیلا ہی شرمیلا کے ہاں چائے پر چلا گیا۔

اس نے مجھے دیکھتے ہی پوچھا۔

”اشفاق صاحب نہیں آئے کیا؟“

میں نے کہا۔

”ابھی آجائیں گے۔ انہیں ریڈیو کے لئے ایک ضروری تقریر لکھنی
پڑی ہے۔“

شرمیلا کے چہرے پر مایوسی کا غبار سا چھا گیا۔ اس نے اپنی آنٹی سے
راہِ تعارف کرایا۔ شرمیلا نے چائے کا بڑا اہتمام کر رکھا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ
اہتمام زیادہ تر اشفاق احمد کی خاطر کیا گیا ہے۔ میں وہاں کچھ شرمندگی سی
موس کر رہا تھا۔ شرمیلا کی آنٹی کو بھی اشفاق سے ملنے کی بڑی آرزو تھی۔
بنے گئی۔

”اشفاق صاحب تقریر لکھنے کے بعد آجائے۔ ہم ان سے بڑی باتیں

کرنا چاہتے تھے۔“

میں نے یونہی کہہ دیا۔

”شاید آجائیں، مگر میرا خیال ہے کہ انہیں وہیں رات کے نو بج
جائیں گے۔“

اس شام برف بھی نہیں گر رہی تھی۔ کل کی گری ہوئی برف راستوں
جی ہوئی تھی۔ سردی بہت تھی۔ شرمیلا نے کمرے کے آئینہ ان میں آگ
رکھی تھی۔ کمرے کی فضا نیم گرم اور پرسکون تھی۔ میں نے سگریٹ سلگایا
شرمیلا کی آنٹی نے برا سامنہ بنایا۔ میں سمجھ گیا کہ اسے سگریٹ کا دھواں

پسند نہیں ہے۔ میں نے اس کی ہالکل پروانہ کی اور جان بوجھ کر سگریٹ کا کسٹ لگا کر آدھا دھواں اس کی طرف پھینک دیا۔ آنٹی اٹھ کر کچن میں چلی گئی۔ شرمیلا موسم کی باتیں کرنے لگی۔ پھر اردو افسانے پر گفتگو شروع ہوئی۔ میں مسلسل کوشش کر رہا تھا کہ میرے سگریٹ کا دھواں کچن کی طرف جائے جہاں شرمیلا کی آنٹی خدا جانے کیا کر رہی تھی۔ میں اس موٹی آنٹی کو زیادہ سے زیادہ سگریٹ کی دھوئی دینا چاہتا تھا۔ خدا جانے میں کیوں چاہتا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد آنٹی کچن میں سے نکل کر وہ رے پاس آکر بیٹھ گئی۔ اس وقت میں سگریٹ نہیں پی رہا تھا۔ میں آنٹی کو دھوئی دینے کے لئے سگریٹ سلگانے لگا تو شرمیلا نے کہا۔

”آپ اتنے سگریٹ نہ پیا کریں۔“

میں نے شرمیلا کا خیال کر کے سگریٹ والپس پیکٹ میں رکھ دیا۔
”میں زیادہ نہیں پیتا۔ بس کبھی کبھی خواہ خواہ سگریٹ سلگانے کو دل کرتا ہے۔“

اس وقت میں شرمیلا کی موٹی آنٹی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ یہ آنکھوں سے دیکھنا بھی عجیب ہے۔ میرا خیال ہے اس کا مطلب کان اور آنکھوں کے درمیان میں سے کسی کو دیکھنا ہوتا ہے۔



شرمیلا کے ہاں سے میں کافی دیر بعد واپس آیا۔
رات کا اندھیرا مری میں پھیل چکا تھا۔ بال روڈ کی بتیاں سو کر رہے ہیں جھللا رہی تھیں۔ ان کی روشنی کھبوں تک ہی محدود تھی۔ ساری سڑک دیر ان تھی۔ سمز بھی بند ہو چکا تھا۔ میں برف کے درمیان بنے ہوئے راستے پر آہستہ آہستہ چڑھائی چڑھتا اوپر ریڈیو سٹیشن کی طرف سے دیئے ہوئے کواٹروں میں چلیا۔ اشفاق احمد جاگ رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی بولا۔
”بیوی دیر لگا دی۔ اتنی دیر یہاں کیا کرتے رہے؟“
میں نے اوور کوٹ اتارتے ہوئے کہا۔
”کیا کرنا تھا۔ شرمیلا تمہاری تعریفیں کرتی رہی۔ میں سنتا رہا۔“
”میری طرف سے معذرت کر دی تھی نا؟“
”کر دی تھی۔“ میں نے بستر پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”ویسے تم چلے جاتے تو ان لوگوں کو بڑی خوشی ہوتی۔ انہوں نے چائے کا بڑا اہتمام کر رکھا تھا۔“

”بس یار۔“ اتنا کہہ کر اشفاق چپ ہو گیا۔

اس کے بعد ہم ایک مہینہ کوہ مری میں رہے۔ اس دوران دو تین بار شرمیلا سے ہماری ملاقات ہوئی۔ ایک بار ماں روڈ پر آتے جاتے۔ دوسری بار میونسپل لائبریری میں اور تیسری بار سمز ریسٹوران میں۔ اتفاق ایسا ہوا کہ تینوں بار اشفاق میرے ساتھ نہیں تھا اور شرمیلا اشفاق احمد کو یاد کرتی رہی۔ ہم لوگ کوہ مری کو الوداع کہہ کر واپس لاہور آ گئے۔

لاہور میں ہم دونوں کی نئی بھرپور ادبی زندگی کا دور شروع ہو گیا۔ اس کے بعد کوہ مری والی شرمیلا سے ملاقات نہ ہو سکی۔ شروع شروع میں ہم باتوں باتوں میں اس کا ذکر کیا کرتے تھے۔ پھر وہ ہمارے ذہنوں سے بھی اتر گئی۔

یہ سات برس پہلے کی بات ہے کہ میں ٹیلی ویژن سٹیشن سے نکل رہا تھا کہ ایک ٹیکسی گیٹ کے پاس آ کر رکی۔ اس میں ایک فیملی بیٹھی ہوئی تھی۔ بچے تھے، دو عورتیں تھیں۔ ادنیٰ عمر کی ایک موٹی عورت باہر نکل کر ٹیکسی والے کو پرس میں سے پیسے نکال کر دینے لگی۔ دوسری عورت جوان تھی وہ بچوں کو باہر نکالنے لگی۔ ادنیٰ عمر کی موٹی عورت کو دیکھتے ہی مجھے خیال گزرا کہ اس عورت کو میں نے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔ اس وقت وہ عورت پلٹ کرٹی وی کے گیٹ کی طرف بڑھی۔ ہم دونوں کی نظریں ملیں۔ وہ بھی ٹھٹھک گئی۔

اب ہم دونوں نے ایک دوسرے کو پہچان لیا تھا۔ یہ وہی 1948ء کے کوہ مری والی افسانہ نگار شرمیلا تھیں۔ اس کی اسٹیلکٹ بوڑھی اور موٹی ہو گئی ہوئی تھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے مل کر شرمسار ہو رہے تھے کہ ہم کیوں مل گئے۔ ہمیں نہیں لگتا جیسے تھا۔ ملنے کی عمر تو وہی تھی جب ہم کوہ مری میں ملے تھے۔ جب اس وقت مل کر ہم وقت کے ہاتھ سے پھسل کر گر پڑے تو اب مرنے کی کیا ضرورت تھی۔ عمر نے اس کے چہرے پر سے ذہانت اور رومانوی افسردگی کی تمام روشنیاں گل کر دی تھیں۔ اس کے جسم کی وہ تمام دلی پتلی پک ڈنڈیاں جو کوہ مری کے برف پوش درختوں کے درمیان سے ہو کر گزرتی تھیں، بوسا پے اور موٹاپے کے بادلوں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے غائب ہو چکی تھیں۔ اس کے سر کے بالوں پر بھی میرے بالوں کی طرح وقت کی برف گر رہی تھی۔ کوہ مری میں جب ہمارے بالوں پر برف گرتی تھی تو ہم اسے جھٹک کر جھاڑ دیا کرتے تھے۔ مگر اب جو برف گر رہی تھی وہ ہمارے بالوں کو سفید کرنے کے لئے گر رہی تھی۔

اس نے دوسری عورت سے میرا تعارف کرایا۔ یہ میری بیٹی ہے۔ یہ

اس کے بچے ہیں۔ اس عورت نے ایک سرسری سی نگاہ مجھ پر ڈالی اور پھر بچوں کو ٹیکسی میں سے باہر کھینچنے لگی۔ میں نے شرمیلا سے اشفاق کا ذکر کرتے ہوئے پوچھا۔

”اشفاق احمد سے ملاقات نہیں ہوئی؟“ اس نے سپاٹ پھرے کے ساتھ میری طرف دیکھا۔ جیسے کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔ جیسے وقت کے کوڑے کرکٹ میں سے سوئی حلاش کر رہی ہو۔

”ہاں! اشفاق صاحب سے نہیں۔ ان سے پھر ملاقات نہیں ہوئی۔

ہم لوگ دہلی میں ہوتے ہیں۔ وہاں میرے میاں کا اپنا کاروبار ہے۔“

ایک لڑکا گیٹ کی طرف دوڑا تو شرمیلا نے اپنی بیٹی کو چمک کر کہا۔

”بیٹی صغرا! اسے پکڑ۔“

میں نے شرمیلا سے اس ملاقات کا ذکر اشفاق احمد سے کیا تو وہ بیدار حیران ہو کر پوچھنے لگا۔

”کون شرمیلا؟“

جب میں نے کوہ مری کے زمانے کا ذکر کیا تو وہ ہنس پڑا۔

”اچھا؟ یا وہ کیسی تھی؟“

میں نے کہا۔

”بس ویسی ہی تھی جیسے ہم ہو گئے ہیں۔“

”ہاں یارا! بڑا وقت گزر گیا ہے اس بات کو۔“

وقت بہت گزر گیا تھا۔ وقت اب بھی گزر رہا ہے۔ پہلے اس کے گزرنے کا پتہ نہیں چلتا تھا۔ اب وہ جسم کے ہر حصے پر سے گزرتا نظر آتا ہے۔ کبھی وہ نقش و نگار بناتا تھا۔ اب وہ نقش و نگار بگاڑ رہا ہے۔ اس نادان بچے کی طرح جو اپنی ہی بنائی ہوئی تصویر پر لکیریں مار رہا ہو۔ اگر کسی شے پر وقت کا اثر نہیں ہوتا تو وہ محبت ہے۔ محبت کا جذبہ ہے۔ محبت کے ساتھ چلتے

ساتھ جھوڑ دیا ہے جو آدمی پر وقت کا اثر نہیں ہونے دیتیں۔ اتنی مدت گزر جانے کے بعد، اتنا سفر طے کر لینے کے بعد، صحراؤں، بیابانوں، وادیوں سے گزر کر پہاڑ کی چوٹی پر پہنچنے کے بعد نیچے نگاہ ڈالتا ہوں تو مجھے اشتقاق احمد کے ساتھ ایک بھی خوشبو ایک بھی پری دکھائی نہیں دیتی۔ اس کا ان چیزوں کے ساتھ کبھی بھی کوئی رابطہ نہیں رہا۔ یہ چیزیں اس کے مزاج کے بالکل خلاف ہیں۔ یہ رات کی رانی کا ہی حوصلہ ہے کہ وہ سارا دن خوشبو کے سیلاب کو اپنے سینے میں دبائے رکھتی ہے۔ کیا محال ہے کہ رات ہونے سے پہلے خوشبو کی ہلکی سی ممک بھی اس کے سینے سے باہر نکل آئے۔ یہ صبر، یہ تحمل، یہ برداشت رات کی رانی کو نیچر نے سکھائی ہے جس کی خوشبو میں ننھی ننھی پریاں بن کر اس کے آگن میں تازل ہوتی ہیں۔

برسات کا موسم تھا۔ میں اشفاق احمد کے پاس اس کے اردو مرکز والے دفتر میں بیٹھا تھا۔ مشرق کی جانب سے کالی گھٹنا اٹھی اور دن کے وقت اندھیرا سا چھا گیا۔ کمرے میں اسے سی لگا تھا۔ شیشے کی ریگ والی دیوار بند تھی۔ شیشے میں سے باہر درختوں کی شاخیں ہوا میں جھومتی نظر آ رہی تھیں۔ میں نے اشفاق سے کہا۔

وہ اے سی والا کمرہ نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ مگر میرے ساتھ باہر برآمدے میں گیا۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ بارش شروع ہو گئی۔ پہلے ہلکی ہلکی پھر تیز ہو گئی۔ بارش کی بو چھائیں برآمدے میں ہمارے اوپر آنے لگیں۔ ان ہواؤں میں بارش کی خوشبو میں تھیں۔ سارے درختوں سارے پودوں سارے مرنے پرنے والوں کی خوشبو میں تھیں۔ نہ جانے کیسے اور کیوں مجھے بارش کی گیلی ہوا میں مسند کی خوشبو کی اسی محسوس ہوئی اور مجھے لگا کہ میں سنا ہوا ایک گیت یاد آ گیا۔

علاج کا منزل پانی

تیرا جیون ایک کہانی

ان دنوں مجھے کچھ پتہ نہیں تھا کہ لنگا کیا ہے۔ نزل پانی کیا ہوتا ہے۔ جیون کیا ہے اور کہانی کیا ہوتی ہے۔ بس سامنے ایک سمندر تھا۔ پیچھے تاریل اور کیلے کے درخت تھے۔ رنگوں کے بارش میں بھٹکتے بازار تھے۔ میلی سڑک پر چمکی دکانوں کی روشنیاں تھیں اور فضا میں پھیلی ہوئی چائے، کافی، سنگار اور سمندر کی خوشبوئیں تھیں۔ بارش کی بوچھاڑیں زیادہ تیز ہو گئیں تو اشفاق نے کہا۔

”پلو اندر چل کر بیٹھے ہیں۔“

لاہور کے فائدہ مست شاعروں ادیبوں کے ساتھ اشفاق احمد کا باقاعدہ اٹھنا بیٹھنا کبھی بھی نہیں تھا۔ ایسا کوئی شاعر ادیب راستے میں مل جاتا تو اشفاق اس کے ساتھ انتہائی خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتا اور بعد میں مجھے کہتا کہ یار ان لوگوں کی زندگی پر مجھے رشک آتا ہے۔ اپنے حال میں مست رہتے ہیں لیکن حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ اشفاق احمد کو اس قسم کے شاعروں ادیبوں پر کبھی رشک نہیں آتا۔ فائدہ مست اور سفید پوش محنت کش شاعروں ادیبوں سے اشفاق احمد پاک ٹی ہاؤس کے زمانے میں ہی الگ ہو گیا تھا۔ اس زمانے میں بھی وہ ان لوگوں کو صرف ٹی ہاؤس میں ملتا۔ اس نے شروع ہی سے اپنے لئے جو راستہ چنا تھا۔ وہ کبھی بستیوں سے ہوتا ہوا قصر سلطانی کی طرف جاتا تھا۔ وہ قصر سلطانی پر تو اپنا شمعین نہ بنا سکا مگر وہاں سے واپس بھی نہ آیا۔ وہ انسر ٹائپ کے سرکاری ادیبوں میں بیٹھ کر بڑا خوش ہوتا ہے۔ اس قسم کے ادیبوں اور شاعروں میں بیٹھ کر جب میں اسے سیاست اور سیاسی جوڑ توڑ کے بارے میں بڑی گرجوشی سے باتیں کرتے دیکھتا ہوں تو مجھے یقین نہیں آتا کہ یہ وہی افسانہ نگار ہے جس نے ”مہمان ہمار“ اور ”گنڈریا“ جیسے افسانے لکھے تھے۔ اس وقت میرا دل چاہتا ہے کہ میں اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے باہر درختوں کے پاس لے جاؤں۔ اگر باہر درخت نہ ہوں تو نہ سہی کم از کم کھلا آسمان تو ہوگا۔

آسمان پر پرواز کرتا ایک آدھ پرندہ تو ہوگا۔ مجھے وہ دن یاد ہے جب ہم دونوں اپنے ایک دوست کی گاڑی میں بیٹھ کر شیخوپورے والی سرپر گئے تھے اور اشفاق احمد نے شلوار فیض سمیت سر میں چھلانگ لگا دی تھی۔ یہ کام میں بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس وقت مجھے وہ بڑا اچھا لگا تھا۔ سر میں تھرتے ہوئے اس کی شلوار منگ کی طرح پھول مچی تھی۔ مجھے بڑی ہنسی آئی تھی۔

اشفاق احمد غلوئے کیسا ہے؟ اس کے متعلق اس کی بیگم بانو قدیمہ ہی بہتر جانتی ہے لیکن میرا خیال ہے کہ وہ اچھا خاوند ہوگا۔ اس کی ایک اور بات مجھے بہت پسند ہے کہ وہ اپنے گھریلو معاملات اپنے تک ہی محدود رکھتا ہے۔ مجھ سے کبھی اپنے بچوں کے بارے میں بات نہیں کرتا۔ یقین کریں مجھے اس کے بیٹوں کے نام تک معلوم نہیں ہیں اور مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ کون کہاں ملازم ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ میں بھی اپنے دوستوں کے گھریلو معاملات میں کبھی دخل اندازی نہیں کرتا۔ دوستوں کی اولاد سے مجھے پیار ضرور ہوتا ہے مگر میں نے کبھی کرید کرید کر نہیں پوچھا کہ تم کیا کرتے ہو۔ یہ کیوں نہیں کرتے۔ وہ کیوں نہیں کر لیتے۔ کیونکہ میں اتنا جانتا ہوں کہ جس کسی نے جو کرنا ہوتا ہے وہ وہی کرتا ہے بلکہ کر کے رہتا ہے۔ جن لوگوں نے دوسروں کی نصیحتوں اور مشوروں پر عمل کیا میں نے انہیں آخر میں بچھڑاتے ہی دیکھا ہے۔

اشفاق احمد کا ہینڈ رائٹنگ بہت اچھا ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ وہ ریڈیو وغیرہ کے سکرپٹ عام طور پر کانفز کی سلیپ کٹ کر ان پر لکھتا ہے اور کالی روشنائی والا انڈی چین استعمال کرتا ہے۔ کانفز پر لکھے ہوئے اس کے الفاظ ہلے سیدھے اور کوٹھتے ہوئے اور جھے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس کا تجربہ تو کوئی ہینڈ رائٹنگ کا ماہر ہی کر سکتا ہے۔ مجھ اس کی لکھائی بڑی اچھی لگتی ہے۔ جب کبھی اس کا کوئی خط یا کسی رشتے پر لکھا ہوا کوئی پیغام مجھے ملتا ہے تو میں اس کی لکھائی دیکھ کر بڑا خوش ہوتا ہوں۔ اردو زبان کے قواعد پر اسے کافی

مبور حاصل ہے اور بڑے بر محل الفاظ استعمال کرتا ہے۔ اپنا مفہوم ادا کرنے کے واسطے وہ لفظ ڈھونڈ کر لاتا ہے۔ مجھے اس سے اختلاف بھی ہے اور اختلاف یہ ہے کہ وہ دلی لکھنؤ والوں کی زبان لکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس سے میری مراد یہ ہرگز نہیں کہ وہ دلی لکھنؤ کی زبان کے محاورے استعمال کرتا ہے۔ میری مراد یہ ہے کہ وہ بعض چیزوں کے نام جو پنجابی میں عام ملتے ہیں دلی لکھنؤ میں بولے جانے والے نام لکھتا ہے۔ اکثر اوقات اسی کے جملوں کی بناوٹ بھی اہل زبان کی نقل میں ہوتی ہے۔ میں اسے ان نیچل بات سمجھتا ہوں۔ کیونکہ ہم پنجاب میں پیدا ہوئے ہیں۔ ہمیں وہی اردو لکھنی چاہیے جو ہم پر پنجابی زبان کے سانچے میں ڈھل کر وارد ہوتی ہے۔ لکھنؤ کی زبان کے بارے میں میں کچھ نہیں کہتا۔ دلی کی زبان کے بارے میں اتنا ضرور کہوں گا کہ دلی والوں کی اردو لکھنے کے لئے دلی شہر میں کم از کم سات سو برس تک قیام کرنا ضروری ہے۔

اشفاق احمد سے اب کسی تقریب پر ہی ملاقات ہوتی ہے اور اس میں شرط یہ ہے کہ تقریب بھی کوئی دوسرا کرے۔ میں خود اپنے کام میں مصروف ہوتا ہوں۔ اس کے باوجود میں دو چار مہینوں میں اس سے ملاقات کرنے کا کوئی نہ کوئی وقت نکال لیتا ہوں اور کسی دوست کی گاڑی میں میں اس سے ملنے چلا جاتا ہوں۔ مجھے دیکھ کر وہ بڑا خوش ہوتا ہے۔ ہم ڈرائیونگ روم کھلو کر بیٹھ جاتے ہیں۔ چائے آجاتی ہے۔ میں بڑے اہتمام سے خود چائے بناتا ہوں۔ شروع شروع میں اس کے ہاں چائے اچھی نہیں ہوتی تھی۔ مگر اب اس نے بڑی عمدہ چائے منگوا رکھی ہے۔ ہم چائے پیتے ہوئے دنیا جہان کی باتیں کرتے ہیں۔ وہ اپنے خاص انداز میں بڑی مزیدار باتیں سناتا ہے۔ یہ باتیں نہ علمی ہوتی ہیں نہ ادبی ہوتی ہیں۔ نہ سیاسی ہوتی ہیں نہ معاشی اور نفسیاتی ہوتی ہیں۔ بس کچھ پرانے دنوں کا ذکر کرتے ہیں۔ کچھ نئے زمانے کی باتیں کرتے ہیں۔ اسی طرح ایک بار میں اشفاق کے ڈرائیونگ روم میں بیٹھا تھا۔ ہم

چائے بھی پی رہے تھے اور باتیں بھی کر رہے تھے کہ ہم نے سوچا کیوں نہ ایک دن باہر نکل کر اپنی پرانی یادگاروں کی سیر کی جائے۔ اشفاق احمد نے کہا۔

”اگلے ہفتے کوئی دن رکھ لو۔“

ہم نے ایک دن مقرر کر لیا۔ اس روز موسم بڑا خوشگوار تھا۔ سردیوں کی آمد آمد تھی۔ دھوپ میں وہ شدت نہیں رہی تھی۔ اشفاق احمد میرے گھر آگیا۔ میں پہلے سے تیار بیٹھا تھا۔ ہم گاڑی میں بیٹھ گئے۔ اشفاق نے پوچھا۔

”کیا خیال ہے پہلے کس طرف چلا جائے۔؟“

میں نے کہا۔

”سمن آباد میں ہیں تو پہلے کیوں نہ تمہارا سمن آباد والا مکان دیکھا جائے۔ اگرچہ اب اس کی جگہ ایک دو منزلہ کونٹری بن چکی ہے مگر وہ جگہ تو وہی ہے۔“

”ہاں یار! پہلے وہیں چلتے ہیں۔“

اشفاق احمد کا سمن آباد والا مکان میرے مکان سے زیادہ دور نہیں تھا۔ اس نے گاڑی سکول کی دیوار والی سڑک پر ڈال دی۔ سکول سے آگے بائیں جانب سمن آباد کی مسجد خضر والی گراؤنڈ آگئی۔ اشفاق بڑے غور سے دائیں جانب کے ٹانگی کے درختوں کو دیکھ رہا تھا۔ کہنے لگا۔

”یہیں کہیں ہمارا گھر تھا۔“

میں نے کہا۔ ”گاڑی اسی طرف کھڑی کرلو۔“

اس نے گاڑی بائیں طرف درختوں کے نیچے کھڑی کر دی۔ میں نے سامنے والی دو منزلہ کونٹری کی طرف اشارہ کیا۔

”یہاں ہوتا تھا تمہارا مکان۔“

اشفاق احمد بڑی دلچسپی سے کھڑکی کا شیشہ اتار کر سامنے والی دو منزلہ کونٹری کو دیکھنے لگا۔

”یہ جگہ کتنی بدل چکی ہے۔“

پھر اس نے گراؤنڈ کی طرف نگاہ ڈالی اور کہا۔

”یہاں کھجور کے تین درخت ساتھ ساتھ اگے ہوئے تھے۔“

”ہاں جنہیں میں تمہری سسڑا کہا کرتا تھا۔“

اب ان درختوں کا نام و نشان بھی باقی نہیں تھا۔ اس زمانے میں گراؤنڈ میں خاک اڑا کرتی تھی۔ ساری گراؤنڈ میں کھجور کے صرف تین درخت تھے جو ساتھ ساتھ اگے ہوئے تھے۔ باقی ساری گراؤنڈ کلرزہ تھی۔ اب وہاں سرسبز گھاس تھی۔ پھولدار پودے لہرا رہے تھے۔ سنبل اور پاپولر کے درختوں کے جھنڈ سایہ کئے ہوئے تھے۔

ہم گاڑی سے نکل آئے اور سڑک کے کنارے وہاں آکر کھڑے ہو گئے، جہاں بیڑیاں نیچے باغ میں اترتی تھیں۔ اس نے کہا۔

”یہاں ایک آدمی بیٹھا سائیکل مرمت کرنے کا کام کرتا تھا۔ اس

نے سائیکل کے ٹائیر درخت پر لٹکائے ہوتے تھے۔“

میں نے کہا۔

”موت ہوئی وہ یہاں سے غائب ہو چکا ہے۔ کیونکہ تمہارے یہاں

سے جانے کے بعد میں سمن آباد میں آ گیا تھا۔“

ہم گراؤنڈ والے باغ میں تھوڑی دیر تک روٹوں پر پھرتے رہے۔

سنبل کے درخت بڑے گھنے تھے۔ میں نے کہا۔

”یہ ابھی بچے ہیں۔ میرے سامنے چھوٹے چھوٹے تھے۔ یہ درخت

کچھ نہیں تو پانچ چھ سو سال تک جاتا ہے۔“

میں نے سنبل کے درخت کے تنے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

”یہ میرا یاد ہے۔ میں صبح میر کرنے یہاں آتا ہوں تو یہ میرے

انتظار میں جاگ رہا ہوتا ہے۔ درخت کبھی نہیں سوتے۔ اگر سوتے

بھی ہیں تو سوائے درختوں کے اور کسی کو پتہ نہیں چلتا۔“

کینریوں میں گلاب کے رنگ برنگ پھول کھلے ہوئے تھے۔ ساتھ والی

گراؤنڈ میں لڑکے کرکٹ کھیل رہے تھے۔ اشفاق نے گھرا سانس بھرا اور بولا۔

”وقت کتنی تیزی سے گزر گیا ہے۔“

ہم گاڑی میں بیٹھ کر سمن آباد سے باہر نکل آئے۔ اشفاق نے پوچھا۔

”اب کس یادگار کی طرف چلیں؟“

میں نے کہا۔

”یہاں سے گاڑی شملہ پہاڑی کی طرف ڈال دو۔ پرانے ریڈیو

سٹیشن والی جگہ کو پہل کر دیکھتے ہیں۔“

”اوئے کم بخت! کیا یاد کرا دیا۔ چلو وہیں چلتے ہیں۔ گریار! وہاں تو

اب کچھ بھی نہیں ہوگا۔“

”جو بھی کچھ ہوگا چل کر دیکھتے ہیں۔“

ہماری گاڑی جب گورنمنٹ ہاؤس کے پیچھے سے ہو کر شملہ پہاڑی سے

مال روڈ کی طرف جاتی سڑک پر آئی تو اشفاق نے کہا۔

”یہ سڑک تو پہچانی نہیں جاتی۔ تمہیں یاد ہے یہاں دونوں جانب پکی

ایٹنوں کے چھوٹے فٹ پاتھ ہوا کرتے تھے جن کے اوپر سرخ

پھولوں والے درخت سایہ کئے ہوئے تھے۔“

میں نے کہا۔

”مجھے سب یاد ہے۔ ہم نے وہ درخت قتل کر دیئے ہیں اور اب خود

قتل ہو رہے ہیں۔“

ہم پرانے ریڈیو سٹیشن والی سڑک پر آکر ایک کوٹھی کے سامنے رک

گئے۔ میں نے کہا۔

”یہاں بھی ریڈیو سٹیشن ہوا کرتا تھا۔“

ہم دونوں اس وقت ناشی کی خوبصورت گھراواں یادوں میں کھو گئے۔

کیسے کیسے فنکار آرٹسٹ یاد نہیں آئے۔ محمد حسین یاد کیا۔ آفتاب احمد، عقیل،

موہنی حمید، شاد امرتسری، سلیم شاہد، اخلاق احمد، ریلوی، سب یاد آئے۔ ایوب

رومانی یاد آئے۔ اسی کی یاد کے ساتھ کئی ایک رومان یاد آئے۔ بائیں جانب ایک چھوٹا سا کھوتا سرسبز پلاٹ ہوا کرتا تھا جس کے کنارے کنارے جامن کے اونچے اونچے درخت اُگے تھے۔ برسات کے موسم میں یہاں ٹھیکیدار کے آدمی جگلی ڈال کر بیٹھ جاتے تھے۔ بڑی بڑی بانس کی نیڑھیاں لگ جاتی تھیں اور درختوں پر سے جامن اتارے جاتے تھے۔ اب وہاں صرف دو درخت دونوں جانب شور مچاتی سڑک کے درمیان حیران پریشان کھڑے تھے۔ پرانے ریڈیو شیش کی عمارت کی جگہ اب ایک نئی کوٹھی بن چکی تھی۔

اشفاق نے مجھے وہ ملی یاد دلائی جو ریڈیو کی کینٹین میں بیٹھی رہتی تھی۔ کینٹین کا لڑکا چائے کا ٹرے لے کر جس کمرے میں جاتا ملی اس کے ساتھ ساتھ جاتی۔ وہاں ایک پرچ میں دودھ ڈال کر دیا جاتا جسے وہ بڑے شوق سے پیتی۔ ایک توبہ شکن انگوڑی لیتی اور واپس کینٹین کے کونے میں آکر بیٹھ جاتی۔ مجھے دوسرے نامور موسیقاروں اور گلوکاروں کے ساتھ استاد برکت علی خان بھی یاد آتے جو بوسکی کا کھانا کرتے، محل کا لالچہ باندھے تلنگے میں سے بڑی درویشانہ سی نیازی سے اترتے۔ دونوں ہاتھوں کی انگلیوں میں سونے چاندی کی انگوٹھیاں چمک رہی ہوتیں۔ پھر ہم دونوں کو کالے خاں صاحب یاد آگئے۔ جو اپنی جوانی کے زمانے میں دن کے وقت دریائے راوی پر ریاض کرنے جایا کرتے تھے۔ پرانے ریڈیو شیش کے زمانے میں وہ کافی معمر ہو گئے تھے۔ ہم دیر تک گاڑی میں بیٹھے ریڈیو شیش کی پرانی یادوں کو زندہ کرتے رہے۔ اشفاق کہنے لگا۔

”جس میں یاد ہے۔ یہاں سے ہی پہلی مرتبہ میں نے اپنا ریڈیو منچر

”تلقین شاہ“ شروع کیا تھا۔“

وہاں سے نکل کر ہم نیلی دیرین شیش والی سڑک یعنی ایبٹ روڈ پر آگئے۔ یہاں گاڑیوں کا اس قدر رش تھا کہ گزونا محال ہو رہا تھا۔ میں نے اشفاق کو وہ دن یاد کرایا جب میں قلعہ گجرات گھگھ والی سڑک سے نکل کر ایبٹ

روڈ کی ٹاہلیوں کے نیچے سے گزرتا پرانے ریڈیو شیش کی طرف جا رہا تھا اور پیچھے سے اشفاق احمد سائیکل پر آ رہا تھا اور وہ میرے قریب آکر سائیکل سے اتر گیا اور پھر ہم باتیں کرتے پیدل چل پڑے تھے۔

اشفاق احمد گاڑی بڑی آہستہ چلا رہا تھا۔ اس کی نظریں سامنے سڑک کے ٹرنک پر لگی تھیں۔ کہنے لگا۔

”یار! اس زمانے میں یہ سڑک کس قدر خاموش خاموش ہوا کرتی تھی۔“

اس زمانے میں سڑک کی دونوں جانب گھنٹان ٹاہلیوں کے درخت ہوتے تھے۔ ہوا ان درختوں میں سے گزرتی تو چوں کے سرسراہٹ کی آواز آیا کرتی تھی۔ ہمارے زمانے میں ٹاہلیوں پر بور آتا تو سارا راستہ ان کی خوشبو سے مہک جاتا تھا۔ کبھی کبھی کوئی ٹانگہ یا سائیکل سڑک پر سے گزرتا تھا۔

ہماری گاڑی کشمی چوک کی ٹرنک لائٹس پر آکر رک گئی تھی۔ میں نے بائیں جانب دانی پلڈنگ کی بالکونی پر نگاہ ڈالی تو اشفاق فوراً سمجھ گیا کہ مجھے کیا یاد آیا ہے۔ کہنے لگا۔

”جس میں ضرور غفور بٹ یاد آگیا ہو گا۔“

غفور بٹ بہت روز ”سکرین لائٹ“ کا مالک اور ایڈیٹر تھا۔ دوسری منزل پر اس کا دفتر تھا جہاں ہم شاعر ادیب تقریباً روزانہ شام کو مل بیٹھتے تھے۔ ہم سب فائدہ مست ادیب تھے۔ اشفاق احمد کبھی کبھی وہ بھی میرے اصرار پر یہاں آجاتا۔ اشفاق احمد نے کہا۔

”وہ کیا چوکھٹا تھا جو غفور بٹ نے اپنے اخبار میں لگایا تھا؟ ذرا وہ

بتاؤ۔“

بات یہ ہوئی تھی کہ مبارک سینما کے مالک ملک مبارک صاحب کا انتقال ہو گیا۔ غفور بٹ بیڑھیاں چڑھ کر پہنچا ہوا آیا اور اپنے ایڈیٹر سے مخاطب ہو کر بولا۔

”جیل! ملک مبارک کی وفات پر معذرت کا چو کھٹا لگانا نہ بھولنا۔“

جیل نے جان بوجھ کر پوچھا۔

”معذرت کا چو کھٹا؟“

غفور بٹ بولا۔

”ہاں یار! وہی کہ ملک مبارک کے انتقال پر ادارہ سکریٹ لائیف ان

کے لواحقین سے معذرت خواہ ہے۔“

غفور بٹ کو یاد کرتے ہوئے ہم نسبت روڈ کی طرف مڑ گئے۔ اب ہم

”لیل و نہار“ یعنی ”پاکستان ٹائمز“ والی بلڈنگ کی طرف جا رہے تھے۔ کبھی

اس بلڈنگ میں روزنامہ ”امروز“ روزنامہ ”پاکستان ٹائمز“ اور ہفت روزہ ”

لیل و نہار“ کے دفاتر ہوا کرتے تھے۔ یہاں بڑی مجلس لگا کرتی تھیں۔ پہلے

امروز کے مولانا چراغ حسن حسرت ایڈیٹر تھے۔ پھر احمد ندیم قاسمی آگئے تو

ادیبوں اور شاعروں کا رخ اس طرف ہو گیا۔ ”لیل و نہار“ کی ادارت اشفاق

احمد کے پاس آئی تو اس کے دفتر میں بھی صبح شام ادیبوں کی رونق رہنے لگی۔

میں تقریباً روز ”لیل و نہار“ کے دفتر میں آجاتا۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ اشفاق کے

بچے سجائے کمرے میں بیٹھ کر اس سے باتیں کرتا اور اس کے بعد پاک ٹی

ہاؤس کی طرف چل دیتا۔

سڑک پر گرد اڑ رہی تھی۔ گاڑیوں کا بے پناہ رش تھا۔ ہماری دائیں

جانب پاکستان ٹائمز کی عمارت آگئی۔ یہ وہ عمارت نہیں تھی۔ اس عمارت کے

کھنڈر کا کھنڈر تھا۔ باہر سے ہی چھتیں ٹپٹی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ جن پالش

کی ہوئی فراخ سیرجیوں پر سے ہو کر ہم لوہا پر جایا کرتے تھے ان سیرجیوں پر

خاک اڑ رہی تھی۔ سیرجیاں ٹوٹ پھوٹ چکی تھیں۔ ساری کی ساری بلڈنگ

عبرت کا نقشہ پیش کر رہی تھی۔ جہاں سڑک کی جانب ”لیل و نہار“ کے دفتر

ہوا کرتے تھے وہاں برآمدے کی کھڑکیاں بوسیدہ ہو کر نیچے کو جھک آئی تھیں۔

چھت کے ٹوٹے ہوئے پرناٹے سے گرتے بارش کے پانی نے ساری دیوار کو

داغ دار کر رکھ تھا۔ پرناٹے کے اوپر پینل کی ٹٹنیاں باہر کو نکلی ہوئی تھیں۔

”یہ تو عبرت کا مقام ہے۔“

اشفاق نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

”مجھ سے تو یہ عمارت پہچانی نہیں جاتی۔“

”تم بڑی مدت کے بعد اوھر آئے ہو۔ اسی لئے میں تمہیں کہا کرتا

ہوں کہ ان جگہوں پر آتے جاتے رہا کرو۔“

میں نے کہا۔

”چلو اب تمہارا ”واستان کو“ کا دفتر دیکھتے ہیں۔“

اشفاق کے چہرے پر ایک افسردہ سی مسکراہٹ تھوڑی دیر کے لئے

نمودار ہو کر غائب ہو گئی۔

”وہاں بھی اب کیا رکھا ہے۔“

ہم ٹیکسٹ آفس کی بگلی سڑک سے نکل کر بڑے ڈاک خانے کے

سامنے آگئے۔ وہاں اتنا رش تھا کہ قی دھرنے کو جگہ نہ تھی۔

”یہ اتنے سارے لوگ کہاں سے آگئے ہیں؟“

اشفاق نے اس سوال پر میں نے کہا۔

”نئی سوال میں نے ایک رکشا ڈرائیور سے کیا تھا۔ میں ریڈیو

سٹیشن سے سمن آبلو جا رہا تھا۔ گرمی بڑی سخت پڑ رہی تھی۔ سڑک

چوگی پر گاڑیوں کی لائن لگی تھی۔ ہمارا رکشا بھی سبز بتی کے انتظار

میں لائن میں لگ گیا۔ میں نے رکشا ڈرائیور سے پوچھا کہ اجے

لوگ کہاں سے آگئے ہیں؟ اس پر رکشا ڈرائیور نے جواب دیا۔

آپ ان سب لوگوں کی مووم شماری کر کے دیکھیں اگر یہ دھڑار

آوی ہیں تو ان میں سے ایک ہزار ساڑھے آٹھ سو آدمی دوسرے

چھوٹے چھوٹے شروں اور گاڑیوں کے ہوں گے۔ لاہور کے آدمی

چند ایک ہی ہوں گے۔ باہر کے آدمیوں نے آکر یہاں اتنا ہجوم کر

دیا ہے۔“

اشفاق بولا۔

”یہ بات کسی حد تک ٹھیک ہی لگتی ہے۔“

اشفاق کھل گیا۔ ہم نے گاڑی مال پر ڈال دی۔ بائیں جانب زیدی فوٹو گرافری دکان کو دیکھ کر اشفاق کہنے لگا۔

”یہ شخص بھی کمال کا فوٹو گرافر تھا۔ خدا کرے اب بھی ہو۔“

اس کے ساتھ والی دکان بیروڈیئر کی تھی۔ مجھے یاد آگیا کہ قیام پاکستان کے زمانے میں میں اور انور جلال شہر اسی دکان پر آکر بال بیویا کرتے تھے۔ یہاں ایک کاریگر بڑے کمال کا ہوا کرتا تھا۔ ایسے بال بناتا تھا کہ بال چھوٹے بھی ہو جاتے تھے اور معلوم بھی نہیں ہوتا تھا کہ حجامت کی گئی ہے۔ اس زمانے میں بال کٹوانے کے پانچ روپے لگتے تھے۔ اس سے ذرا آگے ایک اندر کو گئی ہوئی لمبی دکان تھی۔ یہ دکان ہمارے امرتسر کے ایک دیوبند کل کشمیری نوجوان بیٹے کو لاث ہوئی تھی۔ یہ پسٹلوں کا بیویں وغیرہ کی دکان ہوا کرتی تھی۔ دکان میں ابھی تک مال بھرا ہوا تھا۔ میں وہاں کبھی کبھی جاتا تو بیٹے مجھے دیکھ کر برا خوش ہوتا۔ سب گھر والوں کی خیر خیریت دریافت کرتا۔ پھر دکان کی چھت تک چڑھ کر بولے گاڑی کے بھرے ہوئے خانوں پر ایک نظر ڈال کر کہتا۔

”مجھ میں نہیں آتا اتنے سارے مال کو میں کیسے فروخت کروں گا۔“

میں تو اس دکان کو ہی سچ کر کشمیر چلا گیا ہوں گا۔ یہاں کیا پڑا ہے۔

گرمی ہی گرمی ہے۔“

اس سے ذرا آگے ایک دکان میں گارڈینیا نام کا ریستوران ہوا کرتا تھا۔ نیم روشن، ٹھنڈا، ٹھنڈا ریستوران۔ بہت کم لگاؤک اندر بیٹھے ہوتے۔ ہیرے چل کر میز کے پاس آتے تو ان کی آواز تک نہ آتی تھی۔ یہ ریستوران بھی ختم ہو گیا۔ وقت کی آمدھی اسے بھی اڑا کر لے گئی۔ ہم ریگل سینما کا پوک کر اس کر کے ”راستمان گو“ والی فلی میزک پر آئے تو یہاں گزرنے کے

لئے جگہ ہی نہیں تھی۔ میں نے اشفاق سے کہا۔

”گاڑی ریگل سینما کے احاطے میں لگا دو یہاں سے پیدل چلتے

ہیں۔“

اس نے یہی کیا۔ ریگل سینما کے باہر اگر کوئی شے دیسی کی دیسی تھی تو وہ پھول بیچنے والوں کی گلاب، گیندے اور دوسرے رنگت رنگ پھولوں سے بھری ہوئی بائیاں تھیں۔ آج سے چالیس سال پہلے بھی ان پھول بیچنے والوں کے پاس کوئی دکان نہیں تھی۔ ریگل سینما کے گیٹ کے باہر پھولوں کی ٹوکریاں اور بائیاں سجا کر بیٹھے ہوتے تھے اور آج بھی وہ اسی طرح فٹ پاتھ پر بیٹھے پھول سچ رہے ہیں۔ ریگل سینما کے گیٹ کی دوسری طرف جہاں اب کتابوں کی دکان ہے کبھی شیراز ریستوران ہوا کرتا تھا۔ یہاں کبھی کبھی میں اور اشفاق آ کر چائے پیا کرتے تھے۔ پھر اس کا نام پانز کہنے ہو گیا۔ اس کا مالک پال نام کا ایک بھاری بھر کم باکسر ٹائپ کا آدمی ہوا کرتا تھا۔ جو شام کو ریستوران کے باہر کرسی ڈال کر بیٹھ جاتا۔ دوسری کرسی پر ٹائپیں پھیلا دیتا اور مال پر کبھی کبھی گزرنے والی موٹر کاروں کو ٹکٹا رہتا۔ پھر نہ جانے وہ کہاں غائب ہو گیا۔ اس کے ساتھ سفید ساڑھی اور اداس چہرے والی ایک خاتون بھی بیٹھا کرتی تھی۔ وہ بھی پھر نظر نہیں آتی۔ اس کے آگے ایک بڑا ستور ہے۔ یہاں پہلے سینڈوڈ ہوٹل ہوا کرتا تھا۔ اس ہوٹل کی خاص بات یہ تھی کہ یہاں پہلے پہل انجیل نام کی ڈانس ڈانس کیا کرتی تھی۔ انجیل بعد میں میڈو ہوٹل میں ڈانس کرنے لگی تھی۔ سینڈوڈ ہوٹل میں شراب کے جام بھی چلتے تھے۔ شراب سے مجھے یاد آ گیا۔ گوا لہندی کے چوک میں ایک ہوٹل ہوا کرتا تھا۔ پاکستان قائم ہونے کے بعد ہم یہاں آئے تو میں نے دیکھا کہ اس ہوٹل کے باہر ایک یورڈ لگا تھا جہاں اردو میں لکھا ہوا تھا۔

”یہاں بیٹھ کر شراب پینے کی اجازت ہے۔“

اسی طرح جی پی او کے سامنے لائیڈز تک والی بلڈنگ کے اوپر بہت بڑا

نہیں سائن لگا تھا جس پر انگریزی میں لکھا ہوا تھا۔

”مری سیر بہترین سیر ہے۔“

اب نہ وہ مری کی سیر کر رہی نہ سینڈرڈ ہوٹل رہا نہ سینڈرڈ ہوٹل کی ڈائریکٹر انجیلڈی رہی۔ جو رہی تو سب خبری رہی۔

ہم پھول بیچنے والوں کے پھولوں سے جدا ہو کر داستان گو دفتر کے سامنے والے بس سٹاپ پر آکر ایک طرف ہو کر کھڑے ہو گئے۔ اشفاق نہیں پڑا۔

”یار! ہمارا چھوٹا سا شاہ نشین ٹائپ کا دفتر تو بالکل ہی ویران ہو گیا ہے۔“

وہاں خدا جانے کس نے اپنا دفتر یا دفتر کا گودام بنایا ہوا تھا۔ دفتری تنگ سیڑھیاں ٹوٹ چھوٹ چکی تھیں۔ یہ سیڑھیاں دوسری منزل پر روزنامہ ”آفاق“ کے دفتر کو بھی جاتی تھیں۔ یہ 1952ء کی بات ہے۔ میں روزنامہ ”آفاق“ کے دفتر میں ملازم ہو گیا تھا۔ پہلے میری ڈیوٹی دن کے وقت اخبار کے دوسرے تیسرے صفے پر ہوا کرتی تھی۔ میرے ساتھ ناصر کاظمی اور علی منیان آذقی بھی ہوا کرتے تھے۔ ”آفاق“ اخبار میں آفاق کے نام سے کالم لکھا کرتا تھا۔ پھر میں رات کی شفٹ میں چلا گیا۔ یہ ختم نبوت کی تحریک کا زمانہ تھا جب مال پر بڑی گولی چلی تھی۔ رات کو کرفیو لگتا تھا۔ میں نے پاس ہوا رکھا تھا۔ پھر بھی رات کو ایک بجے گھر واپس جاتے ہوئے اڑ لگتا تھا کہ کسی طرف سے کوئی گولی نہ آجائے۔ اشفاق نے سر کو ہلکا سا جھٹک کر کہا۔

”چلو یار! واپس چلتے ہیں۔ ان کھڑووں میں کب تک پھرتے رہیں گے۔“

میں نے کہا۔ ”ابھی ایک تاریخی کھنڈر کی سیر جاتی ہے۔“

”وہ کونسا کھنڈر ہے؟“

”پاک ٹی ہاؤس۔“

اشفاق بے اختیار خوش ہو کر بولا۔

”ہاں یار! وہاں ضرور چلیں گے۔ چلو۔“

ہم نے گاڑی نکالی اور پاک ٹی ہاؤس کی طرف چل پڑے۔ پاک ٹی ہاؤس کے سامنے جو درخت تھا وہ پہلے سے بہت بڑا ہو گیا تھا۔ اس کی گھنی شاخوں نے سڑک پر سایہ کر رکھا تھا۔ پاک ٹی ہاؤس بھی زبان حال سے اپنی خشکی و خشک کی داستان سنا رہا تھا۔ فرش کی ٹائلیں جہاں سے اکھڑ گئی تھیں وہاں پلستر پھیر دیا گیا تھا۔ چند ایک میزوں پر ایشی چروں والے لوگ بیٹھے تھے۔ سراج صاحب کے بیٹے نے ہمیں پہچان لیا۔ وہ کاؤنٹر چھوڑ کر ہمارے پاس آیا۔ اس کا چہرہ دُور مسرت سے چمک رہا تھا۔

”تو بے نصیب کہ آپ پاک ٹی ہاؤس میں آئے۔“

میں نے کہا۔

”یار! چائے وہی پرانے پاک ٹی ہاؤس والی پلانٹ۔“

”اس سے بھی اعلیٰ چائے آئے گی۔“

پھر اس نے کسی بیرے کو آواز دی۔ بیرا اُٹھیا۔ کسی پرانے بیرے کی صورت اس میں نظر آرہی تھی۔ معلوم ہوا کہ لال ٹائی بیرے کا بیٹا ہے۔ وہ بڑے اہتمام سے چائے بنا کر لایا۔ مگر یہ وہ چائے نہیں تھی جو کبھی ہم وہاں پیا کرتے تھے۔ اشفاق شیشے کی دیوار والی سیٹ کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”تمہیں یاد ہے یہاں شہرت بخداری، قیوم، نظر، حبیب جالب، انجم

رومانی اور امجد الطاف بیٹھا کرتے تھے۔“

ہم کاؤنٹر کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھے تھے۔ میں نے کہا۔

”اور یہاں ناصر کاظمی میرے ساتھ بیٹھا کرتا تھا۔ بیٹھا وہ بھی قیوم

نظر والی ٹولی میں تھا مگر جس روز اس نے تازہ غزل کی ہوتی تھی تو

مجھے ساتھ لے کر اس میز پر آجاتا تھا۔ اس کی آنکھیں چمک رہی

ہوتی تھیں۔ وہ سگریٹ کے ساتھ سگریٹ لگا کر مجھے کہتا۔ تمہیں

اپنی تازہ غزل سنا ہوں۔۔۔

میں نے اوپر گیلری کو جاتے رہنے کو دیکھا۔ زندہ خالی تھا اوپر گیلری بھی خالی تھی۔ رہنے کے پاس بھی ایک میز لگی تھی۔ مجھے یاد آیا۔ ایک بار گرمیوں کی دوپہر کو میں اس میز پر بیٹھا تھا۔ میرے ساتھ شہرت بخاری، قیوم نظر اور محمود جیلانی نامی ایک سٹوڈنٹ بھی تھا جس کا تعلق منگھری سے تھا اور جو گورنمنٹ کالج میں پڑھتا تھا اور گورنمنٹ کالج کے ہوسٹل میں ہی رہتا تھا۔ محمود جیلانی بڑا ادب پرست فوجیوں تھا۔ اتنے میں پاک ٹی ہاؤس کا دروازہ کھلا اور سعادت حسن منٹو نے اندر جھانک کر دیکھا۔ یہ منٹو صاحب کی زندگی کے آخری افسوسناک ایام تھے۔ یہ منظر پورے کا پورا مکمل تفصیل کے ساتھ آج بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ شہرت بخاری نے منٹو صاحب کو دیکھا تو گھبرا کر کہا۔

”اوائے منٹو صاحب آگئے بھاگو وہ پیسے مانگیں گے۔“

قیوم نظر اور شہرت بخاری جلدی سے اٹھ کر اوپر گیلری میں چلے گئے۔ میں اور محمود جیلانی وہیں بیٹھے رہے۔ اس دوران منٹو صاحب ہماری میز پر پہنچ گئے تھے۔ غالباً وہ محمود جیلانی کو دیکھ کر وہاں آئے تھے۔ انہوں نے آتے ہی محمود جیلانی سے پوچھا۔

”تمہارے پاس کتنے پیسے ہیں؟“

محمود جیلانی نے بونے ادب سے ہنسنے کو ان کے آگے رکھ دیا اور کہا۔

”منٹو صاحب! یہ سارے پیسے آپ ہی کے ہیں۔“

مجھے یاد ہے ہنسنے میں دس روپے کے کتنے ہی نوٹ ساتھ ساتھ گئے ہوئے تھے۔ منٹو صاحب نے ان میں سے صرف دو نوٹ نکال کر رکھ لئے اور کہا۔

”بس بیس روپے کافی ہیں۔“

اور جن قدموں سے چل کر وہاں آئے تھے انہی قدموں سے چلتے ہی ہاؤس سے باہر نکل گئے۔ ان دنوں جم خانہ شراب کا ادھا چوہہ روپے میں آیا کرتا تھا۔ ہم دیے تک ٹی ہاؤس میں بیٹھے گزرے زمانے کو گزرے ہوئے زمانے کے چہروں کو یاد کرتے رہے۔ کیسے کیسے لوگ تھے۔ کیسے کیسے چمکیلے چہرے تھے جو ادب کے آسمان پر ستارے بن کر چمکے اور پھر اپنے پیچھے روشنی کی لکیریں چھوڑ کر نظروں سے بیحد بیحد کے لئے غائب ہو گئے۔ کبھی ٹی ہاؤس کے کاؤنٹر پر رکھے گلدان میں ترگس اور گلاب کے پھول مکا کرتے تھے۔ شیشے میں سے ان پر سر دیوں کی دھوپ پڑتی تو وہ بجلی کے بلب کی طرح روشن ہو جاتے۔ اب کاؤنٹر پر نہ گلدان ہے نہ گلدان کے پھول ہیں۔ صرف میں اور اشفاق احمد میز کے آٹھ سائے سر جھکائے بیٹھے پرانے دنوں کو یاد کر رہے ہیں۔ ایک دن آئے گا کہ اس میز پر کوئی اور بیٹھا ہمیں یاد کر رہا ہو گا۔

اے حمید

26-7-95